شیعہ سُنی اختلافات اور دہشتگردی

مؤلفہ

عابدہ اشفاق

ملنے کا پتہ

کریہ پبلیکیشنز

سمیع سینٹر 38 اُردو بازار لاہور

042-37122772
0300-4529232

کتاب کی حفاظت کریں اور
اس سے رہنمائی حاصل کریں
اچھی کتاب بہترین ساتھی

نام کتاب	:	شیعہ سنی اختلافات اور دہشتگردی
مؤلفہ	:	عابدہ اشفاق
کمپوزنگ	:	سید گرافکس اُردو بازار لاہور
باراوّل	:	فروری 2014ء
پرنٹرز	:	سبحان اعظم پرنٹرز لاہور
قیمت	:	250 روپے

ملنے کا پتہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شیعہ سُنی اختلافات اور دہشت گردی

انتساب

اس کتاب کا انتساب میں اپنے شوہر رانا اشفاق احمد کے نام کرتی ہوں کیونکہ اُن کی اجازت اور مدد کے بغیر میں یہ کام کبھی نہ کر سکتی۔

(عابدہ اشفاق)

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ

وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ

فہرست موضوعات

دیباچہ

کتاب ''شیعہ سنی اختلافات اور دہشت گردی'' لکھتے وقت میری خواہش تھی کہ شیعہ اور سنی کے درمیان عرصہ دراز سے چلے آرہے اختلافات کی وضاحت قرآن وسنت اور تاریخ کی روشنی میں کی جائے اور تمام حوالے اہل سنت بھائیوں کی کتب صحاح ستہ اور اُنہی کی تاریخ کی مشہور کتابوں سے لیے جائیں تاکہ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے اُنہیں اعتماد رہے اور وہ اس کتاب کو کسی شیعہ کا ذاتی نقطہ نظر سمجھ کر نظر انداز نہ کردیں اور اس کتاب کا اصل مقصد بھی اہل سنت بھائیوں کے دلوں میں اہل تشیع کے لیے بھری نفرت کو ختم کرنا ہے۔ اور ان اختلافات کی وجہ سے باہمی منافرت نے جو جنم لیا اور انتہائی صورت اختیار کی اور اس کے نتیجے میں دہشت گردی کے بے شمار واقعات سامنے آئے اور یہ سلسلہ جاری ہی نہیں بلکہ وقت کے ساتھ اس میں اضافہ ہو رہا ہے جو کہ پوری ملت اسلامیہ کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ پچھلے چھ مہینے سے میں نے اپنا زیادہ تر وقت اختلافات کو جاننے اور ان کی حقیقت کی تلاش میں

قرآن، حدیث اور تاریخ کا مطالعہ کیا ہے پھر کتاب کا تمام تر مواد انہیں سے لیا ہے۔ دُعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری اس کوشش کو قبول فرمائے اور میرے مقصد (شیعہ اور سنی کے درمیان باہمی منافرت ختم کرنے) میں کامیاب کرے آمین۔ اس کتاب کے اختتام پر میں دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں اپنے استاد محترم جناب سلام اللہ صاحب کی جنہوں نے اس کتاب کے لکھنے میں میری رہنمائی فرمائی۔ میں بہت مشکور ہوں بھائی جان رانا ضمیر اور رانا شبیر کی جو کہ میرے شوہر کے دوست ہیں جن کے کہنے پر میں نے شیعہ سنی اختلافات کو جانا اور تحقیق کی اور فقہ جعفریہ اپنائی۔ دو شخصیات کی خاص شکر گزار ہوں جن کی مدد کے بغیر میں یہ کتاب نہ لکھ پاتی میرے شوہر رانا اشفاق احمد اور میرے بھائی طیب رضا ان دونوں نے حدیث اور تاریخ کی کتابوں سے تصدیق میں میری مدد کی اور کتاب کی اشاعت میں بھی میرا ساتھ دیا۔
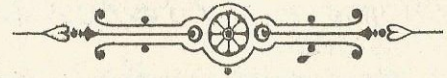
پیش لفظ

میں نے ایک مسلمان سُنی گھرانے میں آنکھ کھولی والد صاحب خاصے مذہبی آدمی تھے۔ مجھے بھی ہوش سنبھالتے ہی دینی تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔ دُنیاوی تعلیم بلکہ ایک سال لیٹ شروع ہوئی۔ گھر میں بھی دینی مسائل کا اکثر ذکر ہوتا تو بہت چھوٹی عمر میں ہی بنیادی دینی مسائل سے آگاہی حاصل ہوگئی۔ میں قرآن پاک کی تعلیم کے لیے مدرسہ جاتی تھی۔ ہمارے قاری صاحب عمرہ کرنے چلے گئے اُن کی جگہ ایک نئے قاری صاحب آئے جو کے بہت سخت تھے ہمارے ہمسائے شیعہ تھے اُن کی بچیاں کہنے لگیں کہ اُن کے قاری صاحب بہت اچھے ہیں اور وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے مدرسہ میں لے گئی مدرسہ سے آکر میں نے گھر بتایا کہ میں ہمسایہ کی بچیوں کے ساتھ اُن کے مدرسہ گئی تھی۔ ابو جی کو پتہ چلا تو اُنہوں نے ڈانٹا اور کہا کہ اُن کے ساتھ کسی قسم کا میل جول نہ رکھا جائے کیونکہ وہ شیعہ ہیں۔ ذہن میں دس سوال آئے کہ وہ بھی تو مسلمان ہیں یہی قرآن وہ بھی پڑھ رہے ہیں تو اُن سے اتنی نفرت کیوں۔ پھر جب میں 10 سال کی تھی ایک شیعہ لڑکی سے دوستی ہوئی تو سختی سے اُس سے دور رہنے کا کہا گیا۔ پوچھا تو سو باتیں سننے کو ملیں وہ صحابہ کا احترام نہیں کرتے۔ وہ نماز غلط انداز میں پڑھتے ہیں۔ وضو صحیح نہیں ہے۔ حضرت علیؑ کو نبیؐ پر ترجیح دیتے ہیں۔ ماتم کرتے ہیں شام غریباں کے واقعات اور کئی باتیں۔ میں

نے دُنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی کافی حاصل کی مثلاً قرآن پاک کو ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ پڑھا۔شیعہ سُنی اختلافات کو لے کر دماغ میں اُٹھنے والے سوالوں کے جواب نہیں جان سکی۔ پھر لوگ شیعہ کو کافر کہتے ہیں اُن کو جان سے مارتے ہیں اور اس کو جرم نہیں سمجھتے۔ اسی بات کو لے کر ماضی میں بہت قتل و غارت ہوئی۔ دہشت گردی ہوئی۔ پھر سوال یہ بھی تھا کہ ایک مسلمان دہشت گرد کیسے ہوسکتا ہے۔ دین کو اتنا تو میں بھی جانتی ہوں کہ جو مسلمان ہے وہ دہشت گرد اور قاتل نہیں ہوسکتا۔

کچھ عرصے سے میرے شوہر کے دوست جو کہ شیعہ ہیں بیٹھے تھے تو شیعہ سنی اختلافات پر بحث چھڑ گئی اُنہوں نے ایسے دلائل دیئے کہ ہم کچھ پریشان ہو گئے کہ جو یہ بات کر رہے ہیں اگر قرآن و حدیث سے ثابت ہے تو پھر حقیقت کیا ہے؟ میں نے اپنے شوہر سے ان معاملات کی تصدیق کرنے کی اجازت حاصل کی اور ایک شیعہ عالم کے ساتھ چار سٹینگز کیں۔ بہت ساری باتیں کافی حد تک واضح تھیں اتوار کو اُن کے ساتھ پورا دن گزارتے اور باقی کا پورا ہفتہ ہم قرآن اور حدیث کی کتابوں سے اُن معاملات کی تصدیق کرتے۔ اسی طرح چھ ماہ کے بعد ہم لوگوں نے فرقہ جعفریہ پر عمل شروع کر دیا جس جس کو پتہ چلا خاندان دُوستوں اور ملنے جلنے والوں نے سوال کرنا شروع کر دیئے پھر کس کس کو جواب دیتے دوسری طرف بات یہ بھی تھی کہ میں نے جن حقیقتوں کو جانا ہے وہ سب کو جان لینی چاہیے کہ انتہا پسندی فرقہ واریت اور اس کے نتیجے میں ہونے والی دہشت گردی کا خاتمہ ہو سکے۔لوگ ساری زندگی کبھی کسی شیعہ

سے کلام نہیں کرتے اور جانے بغیر ہی اُن کو کافر کہتے ہیں۔ اُن سے نفرت کرتے ہیں اور اُن کو صحیح معنوں میں اس بات کا علم بھی نہیں کہ اُن کی نفرت کی وجہ کیا ہے۔ میں دعوے سے کہتی ہوں کہ اگر لوگ جان لیں کہ وہ ان کو کافر کیوں کہتے ہیں تو وہ نہ صرف اُن کو کافر نہیں کہیں گے بلکہ اُن سے محبت کرنے لگیں گے۔ یہی وہ باتیں اور پیغام ہے جو میں سب لوگوں تک پہنچانا چاہتی ہوں تاکہ ہم سب فرقوں میں بٹنے کے بجائے ایک ہو کر دہشت گردی کا مقابلہ کرسکیں نہ کہ اُس کا حصہ بنیں۔

شیعہ سُنی عقیدہ توحید سے لیکر قیامت تک ایک ہی لائن پر چلتے ہیں۔ دونوں میں چند اختلافات ہیں جن کو لے کر دونوں فرقے ایک دوسرے کو اپنے پیچھے چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بلاشبہ بہت سے لوگ ان اختلافات کا حل اور منزل تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ڈھونڈنا چاہتے ہیں اِس کوشش کو کامیابی تک پہنچانے کی شرط یہ ہے کہ حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن و حدیث اور تاریخ کا مطالعہ کیا جائے اور خلوص کے ساتھ غور کیا جائے تو خدا تعالیٰ مدد کرے گا اور مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔

میں ایک ایک کر کے تمام اختلافات کو بیان کروں گی اور قرآن و حدیث کی روشنی میں واضح کروں گی تاکہ پڑھنے والا ان کو میرے نظریات نہ سمجھے بلکہ خود قرآن و حدیث سے تصدیق کرے خود تحقیق کرے جیسا کہ میں نے کی اور خود نتیجہ اخذ کرے اور جان لے کہ کون صحیح اور کون غلط ہے اور جو شیعہ کو کافر کہتے ہیں اُن میں اگر حوصلہ ہے تو ان تمام آیات قرآنی اور حدیثوں کو صحاح ستہ میں سے تصدیق کریں اور اپنے ذہن سے فیصلہ کریں۔

پہلا اختلاف شیعہ صحابہ کو نہیں مانتے؟

اہل سنت کا کہنا ہے کہ شیعہ صحابہ کو نہیں مانتے، اُن کو بُرا بھلا کہتے ہیں اور کیونکہ وہ صحابہ رسولؐ کی توہین کرتے ہیں اس لیے کافر ہیں۔ کیونکہ نبیؐ نے فرمایا:

میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے جس کی بھی اتباع کرو گے ہدایت پاؤ گے۔

اور وہ اُن باتوں کو سامنے رکھتے ہیں جو اُن کو بچپن سے ہی سکھائی جاتی ہیں کہ اُن صحابہؓ نے نبیؐ کا ساتھ دیا بہت کچھ کیا لہٰذا وہ قابل تعظیم ہیں اور اگر کوئی شخص اُن کی شان میں گستاخی کرے اُسے کافر کہا جاتا ہے قتل کر دیا جاتا ہے اور ایسے شخص کے قتل کو غلط بھی نہیں سمجھا جاتا۔

اسی بات کی بنیاد پہ عرصہ دراز سے دُنیا میں اور خاص طور پر پاکستان میں بے پناہ قتل و غارت ہوئی ہے۔ بے شمار شیعہ حضرات کو شہید کر دیا گیا اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

صحابہ رسولؐ تو صحابہؓ رسولؐ ہیں کسی حیوان بلکہ بے جان کو بھی اگر رسولؐ سے نسبت ہے تو اس کو بھی محبت اور احترام کی نظر سے دیکھنا ضروری ہے۔ صحابہؓ رسولؐ سے اگر کسی کو صرف اس لیے بغض و عداوت

ہو کہ وہ صحابہؓ رسولؐ تھے تو وہ نہ شیعہ ہے نہ مسلمان بلکہ کافر اور بے دین ہے۔ لیکن سوائے ذات احدیت کے ہر شے کی ایک حد ہے اور دینداری یہی ہے کہ نہ کسی چیز کو اس مقام سے بڑھاؤ اور نہ اس کی حد سے گراؤ۔

غیر معصوم کو معصوم کا ہم پلہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہر معصوم کو سید الانبیاءؐ کا درجہ نہیں دیا جا سکتا اور سیدالانبیاءؐ کو خدا کا ہم سر نہیں مانا جا سکتا۔

بالکل غلط ہے یہ بات کہ شیعہ صحابہؓ رسولؐ سے عقیدت نہیں رکھتے۔ شیعہ اپنے آپ کو رسولؐ کے ہر مخلص صحابی کے پاؤں کی خاک سمجھتے ہیں اور ان کی راہ میں آنکھیں بچھانے کے لیے تیار ہیں۔ کیوں؟ اپنے نبیؐ کی وجہ سے ان سے ہمیں عقیدت ہے، رسولؐ کی خاطر اور اگر کبھی کسی سے شکایت ہے تو رسولؐ کی خاطر۔ یہ ہے شیعہ نقطہ نظر۔ میں پوچھتی ہوں اگر دو صحابہؓ رسول آمنے سامنے ہوں۔ ایک دوسرے کے مخالف ہوں تو آپ کس کو صحیح کہیں گے اور کس کو غلط۔ اہل سنت کا کہنا ہے کہ وہ بھی صحیح ہے وہ بھی صحیح ہے۔ ہم دونوں کا احترام کرتے ہیں۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا دو لوگوں کے درمیان میں جھگڑا ہو اور دونوں ٹھیک ہوں تو بات یقینی ہے کہ ایک ظالم ہے اور دوسرا مظلوم۔ آپ کس کا ساتھ دیں گے۔ کس کا احترام کریں گے۔ حدیث مبارکہ ہے کہ ''ظلم ہوتا ہوا دیکھو تو ہاتھ سے روکو، طاقت نہیں رکھتے تو زبان سے روکو، اس کی بھی طاقت نہیں رکھتے

تو دل میں بُرا جانو اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

پھر ہم کیسے ظالم و مظلوم دونوں کو صحیح کہہ دیں۔ جنگ جمل ہوئی تو اس کا بھی ہر فریق صحابی۔ جنگ صفین ہوئی تو اس کا بھی ہر فریق صحابی۔ منبروں پر، خطبوں میں علیؑ پر سب و شتم (لعنت و ملامت) ہوتی رہی تو یہ کس کی طرف سے ہوتی رہی اور کس پر ہوتی رہی؟ یہ بھی صحابی کی طرف سے ہوتی رہی اور صحابی پر ہوتی رہی۔ اسی قسم کے واقعات میں سے فدک کا واقعہ ہے جس میں ایک طرف حضرت ابو بکر و حضرت عمر جیسے صحابی دوسری طرف صحابیہ رسول فاطمہ زہراؑ جو صرف صحابیہ ہی نہیں بلکہ روح رسولؐ اور بنت رسولؐ ہیں۔ میں اس واقعہ کو جن کتابوں سے تحریر کر رہی ہوں اُن کا ماخذ بھی کوئی شیعہ کتاب نہیں بلکہ تمام تر واقعات و بیانات حضرات اہل سنت کی کتابوں سے لیے گئے ہیں۔
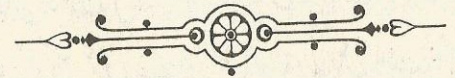
نبیؐ کا ہر صحابی معصوم نہیں

علامہ تفتازانی ایک بلند پایہ عالم جلیل اہل سنت ہیں۔ شرح مقاصد میں فرماتے ہیں:

ان ماوقع بينا لقحائة رضوان الله عليهم من المحاريات والمشاجرات على الوجه المسطور فى كتب التواريخ والمذكور على السنة الثقات يدل بظاهره على ان بعضهم قد جاز عن طريق الحق و بلغ حد الظلم والفسق وكان الباعث له الحقد والعناد والحسد والله دو طلب الملك والريائة والميل ان الذات والشهرات اذليس كل صحابى معصوماً وكل من لقى النبى بالخير موسوماً ......الخ

یعنی وہ لڑائیاں اور جھگڑے جو صحابہؓ کے درمیان پیش آئے جو کتب تاریخ میں موجود ہیں اور مشہور ہیں ظاہر کرتے ہیں۔ صحابہؓ میں سے بعض لوگ راہ حق سے ہٹ گئے تھے اور ظلم کی حد تک پہنچ گئے تھے۔ جس کا باعث یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے سے کینہ اور دشمنی رکھتے تھے۔ باہم

حسد کرتے تھے حکومت اور اقتدار کا لالچ رکھتے تھے دنیا کی لذتوں اور خواہشوں میں جھک گئے تھے لیکن ایسا کیوں تھا؟ کیوں کہ ہر صحابی معصوم نہیں اور ہر وہ شخص جو کہ صحابی ہو ضروری نہیں کہ اس کو ہمیشہ کے لیے راہ ہدایت مل گئی ہو علامہ تفتازانی کی بات کس قدر مختصر اور کس قدر جامع اور قرآن مجید کے مطابق ہے۔ یعنی تمام صحابہؓ معصوم نہ تھے وہ ہمیشہ ہی نیک رہیں گے اس کی کوئی ضمانت نہیں'۔ وہ سب کے سب یکساں نہیں ان میں سے بہتر سے بہتر بھی ہیں اور اس کے برعکس بھی ہیں ان کے لیے یہ تغیر بھی ہوسکتا ہے آج اچھے ہوں یہ بھی ممکن ہے کسی بات میں اچھے ہوں اور کسی بات میں اچھے نہ ہوں۔
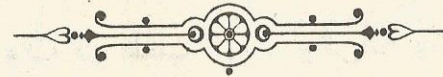
قرآنی آیات
مدح میں اور مذمت میں

قرآن کریم میں جن صحابہ کا ذکر آیا ہے۔ ان کے لیے آیت مدح بھی ہیں اور آیت مذمت بھی ہیں یہ تو کوئی انصاف نہ ہو گا کہ ہم صرف مدح کو دیکھیں اور مذمت کو نظر انداز کو دیں۔

صحابہ کے متعلق ارشاد الٰہی ہے۔

مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ

''یعنی تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو طالب دُنیا رہتے ہیں اور کچھ لوگ ہیں جو آخرت کے طلبگار رہتے ہیں۔'' (آل عمران آیت152)

ان ہی صحابہ میں وہ بھی ہیں جن کا قدم راہ وفا سے کبھی نہ ہٹا جنہوں نے کسی غزوہ میں حضرت رسولؐ کو کفار میں چھوڑ کر راہ فرار اختیار نہ کی بلکہ ہر جگہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ثابت قدم رہے۔ دوسری طرف وہ بھی ہیں جو نہ جنگ احد میں ثابت قدم رہے نہ جنگ حنین میں۔ چنانچہ ان دونوں جنگوں کے متعلق قرآن کریم نے نافرمانی کرنے والوں کی

مذمت کی ہے۔ جنگ احد کے متعلق ارشاد الٰہی ہے۔

حَتّٰۤی اِذَا فَشِلۡتُمۡ وَ تَنَازَعۡتُمۡ فِی الۡاَمۡرِ وَ عَصَیۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَرٰىکُمۡ مَّا تُحِبُّوۡنَ ؕ مِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّرِیۡدُ الدُّنۡیَا وَ مِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّرِیۡدُ الۡاٰخِرَۃَ ۚ

''یہاں تک کہ جب تم نے ہمت ہار دی اور نبوی حکم کے بارے میں مخالفت کی اور عین اس وقت تم نے نافرمانی کی جب کہ اللہ تم کو تمہاری پسندیدہ چیز (فتح) دکھا چکا تھا۔ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طلبگار رہتے ہیں اور کچھ لوگ آخرت کے طلبگار رہتے ہیں۔''

سورۃ آلِ عمران آیت 152

اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ وَ لَا تَلۡوٗنَ عَلٰۤی اَحَدٍ وَّ الرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ فِیۡۤ اُخۡرٰىکُمۡ

''جب کہ تم اوپر (پہاڑ پر) چڑھے چلے جاتے تھے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے حالانکہ تمہارے پیچھے سے رسول تم کو پکار رہے تھے۔'' (سورۃ آل عمران آیت 153)

پھر فرمایا گیا۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَلَّوۡا مِنۡکُمۡ یَوۡمَ الۡتَقَی الۡجَمۡعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسۡتَزَلَّہُمُ الشَّیۡطٰنُ بِبَعۡضِ مَا کَسَبُوۡا ۚ

''یعنی تم میں سے جو لوگ جنگ احد سے بھاگ گئے تھے اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کو شیطان نے ان کے ماضی کے کچھ اعمال کی وجہ سے نیک راستہ سے ہٹا دیا تھا۔'' آل عمران آیت 155

یہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان بھاگ جانے والوں سے درگزر کیا اور عفو کیا۔ یعنی اُس وقت کوئی سزا نہ دی بلکہ چشم پوشی فرمائی لیکن یہ تو کریم کا کرم اور حلیم کا حلم ہے۔ اس سے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ لوگ مجرم نہ تھے یا یہ کہ انہوں نے رسولؐ سے محبت اور وفا کے تقاضوں کو پورا کیا۔

اب اس نقطہ پر غور طلب بات یہ ہے کہ ان حضرات کے غیر معصوم ہونے کی بنا پر جو عام غلطیاں ہو جاتی تھیں۔ ان کے لیے تو عفو ودرگزر کی آیات نہیں آتی تھیں، تو پھر صرف اسی جرم کے لیے کیوں بار بار عفوو درگزر کی خبر دی گئی۔ یہ تخصیص اسی وجہ سے تو ہے کہ یہ جرم معمولی نہیں بلکہ نہایت سنگین تھا۔ جرم کی سنگینی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مدارج النبوۃ میں فرمایا۔

جنگ اُحد میں صحابہ کا طرزِ عمل اور علیؑ کی ثابت قدمی

درروزِ احد از گروہ مخالف چناں پیکار شدید واقع شد کہ مسلمانان روبہزیمت آوردند۔ حضرت رسول رانتہا گزاشتند۔ حضرت درغضب آمدو عرق از پیشانی ہمایونش متقاطر گشت۔ درآں حالت نظر کرو علی بن ابی طالب راکہ برپہلو نے مبارکش ایستادہ است۔ فرمود کہ تو چرابہ برادران

خود ملحق نہ گشتی یعنی فرار نہ کردی۔ علی گفت۔

آ کفر بعد الایمان ان لی بك اسوۃ

یعنی آیا کافر شوم بعد از ایمان بہ تحقیق کہ مرا بہ تو اقتداء است بایاران مفرور چہ سروکار باشد۔ دراین اثناء جمع از کفار متوجہ آنحضرت صلعم شدند آنحضرت فرمود اے علی مرا ازیں مجمع نگاہ دارد۔ حق خدست بجا آ۔ کہ وقت نصرت است۔ پس علی متوجہ آں قوم شد چناں قلع قمع نمود کہ جمع کثیر بہ دوزخ رفتند باقی ماندگان متفرق گشتند۔ می گویند کہ درآن روز شانزدہ زخمہا برتن مبارک جناب امیر رسیدند ازاں جملہ چہار زخم بسیار کاری بودند کہ بوقت رسیدن ہر زخم جناب امیر از فرش زین بزمین آمدندو ہر چہار بار جبریل امین علیہ السلام دے را برداشت وسوارمی کرو۔ وی گفت اے علی جنگ کن کہ خداورسول خدا از تو خوشنود ہستند و چوں ایں حال جاں فشانی علی مرتضی جبریل امیں حضور ختم المرسلین رسانید۔ آنحضرت فرمود کہ علی چراجاں فشانی نہ نماید کہ دے ازمن ست ومن از دے جبریل گفت و من ازشاد علی ہر دو ہستم ومنقول ست کہ درہمیں جنگ رضوان بہ منقبت علی مرتضی می خواند۔

ولا سیف الا ذوالفقار

ولا فتی الا علی الکرار

(مدارج النبوہ شیخ عبدالحق دہلوی از تاریخ احمدی)

ترجمہ:

''یعنی جنگ اُحد میں لشکر کفار نے اتنی سخت کارزار کی کہ مسلمان بھاگ کھڑے ہوئے اور حضرت رسولؐ کو تنہا چھوڑ گئے حضرت اس پر غضبناک ہوئے۔ ایسے کہ ان کی مبارک پیشانی سے پسینہ کے قطرے ٹپکنے لگے۔ اسی حالت میں سرکار نے علیؑ بن ابی طالبؑ کی طرف نظر فرمائی جو نبیؐ کے پہلو میں کھڑے ہوئے تھے۔ سرکارؐ نے فرمایا کہ علیؑ تم اپنے بھائیوں سے کیوں نہ ملحق ہوئے۔ یعنی تم نے کیوں نہ فرار کیا۔ علیؑ نے جواب دیا! میں ایمان لانے کے بعد کافر کیسے ہو جاتا میرے لیے تو آپ ﷺ کا اسوا(پیروی) کرنا ہے۔ اسی اثنا میں کفار کا ایک گروہ محمدؐ کی طرف بڑھا سرکارؐ نے فرمایا اے علیؑ اس گروہ مخالف سے میری حفاظت کرو اور میری خدمت کا حق بجالاؤ کہ یہ نصرت کا وقت ہے پس علیؑ نے اس مقام پر ایسا سخت حملہ کیا اور ان کا ایسا قلع قمع کیا کہ بہت سے ان میں سے دوزخ پہنچ گئے اور باقی ماندہ لوگ متفرق ہو گئے کہتے ہیں کہ اس روز حضرت امیرؑ (علی) کے جسم پر سولہ زخم آئے تھے۔ جن میں سے چار زخم اتنے شدید تھے کہ ان کے پہنچنے کے وقت

جناب امیرؑ ہر مرتبہ زین سے زمین پر گر جاتے تھے اور ہر مرتبہ جبریل امین ان کو اُٹھا کر سوار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اے علی جنگ کیجیے جبکہ خدا اور خدا کا رسول آپؑ سے خوشنود ہیں۔ جب جبریل امین نے علیؑ کی ایسی جان فشانی دیکھی تو حضرت رسولؐ سے اس جان فشانی کا ذکر کیا تو آنحضرتؐ نے جبریل امین سے فرمایا کیوں نہ ایسی جان فشانی کرے کہ وہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں جبریل نے کہا کہ میں آپؐ اور علیؑ دونوں سے ہوں۔''

جنگ اُحد سے چلے جانے والوں میں سے حضرت ابو بکر اور حضرت ابو عبیدہ جراح سب سے پہلے واپس آ کر رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب قرۃ العین میں فرمایا:

عن عائشة قالت قال ابو بكر من الصديق لما جال الناس عن رسول الله يوم احد كنت اوّل من فاء اليه فبصرت به من بعيد فاذا انا برجل اعتنقني من خلقي يريد رسول الله فاذا هوا ابو عبيدة الجراح

مستدرک حاکم اور قرۃ العین کی یہ عبادت تاریخ احمدی میں موجود ہے۔

ترجمہ: ''حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ان سے حضرت ابو بکر صدیق

ؓ نے فرمایا۔

''کہ جب بروز جنگِ اُحد لوگ رسول اللہؐ کو چھوڑ کر متفرق ہو گئے تو ان میں سے میں سب سے پہلے رسولؐ کی خدمت میں واپس آیا اور میری نگاہ دور سے آنحضرتؐ پر پڑی پھر ایک شخص نے پیچھے سے آ کر مجھے دبایا۔ جو پیغمبرؐ کے حضور میں حاضر ہونا چاہتا تھا میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ ابو عبیدہ بن جراح تھے۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراح سقیفہ بن ساعدہ میں حضرت ابو بکر صدیق کی خلافت کے ساعی اور بانی تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ بھی عشرہ مبشرہ بالجنہ میں سے ایک ہیں۔''

حضرت عمرؓ میدان جنگ احد سے ہٹ کر صرف پہاڑ پر چڑھ کر ٹھہر گئے تھے کہیں دور نہیں گئے تھے لیکن حضرت عثمانؓ دور چلے گئے تھے اور تین روز بعد واپس آ گئے۔

پھر تاریخ احمدی نے تفسیر در منثور علامہ جلال الدین سیوطی اور تفسیر جریر طبری سے عبارت نقل کی ہے۔

قال عمر رضی الله عنه لما كان يوم احد خضررت حتى صعلت الجبل فلقد ايتنى المارسى

یعنی حضرت عمر نے فرمایا کہ جنگ احد میں کافروں نے مسلمانوں کو شکست دی تو میں بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گیا تھا اور اس

وقت میری حالت یہ تھی کہ جیسے پہاڑی بکرا۔

اس کے علاوہ تاریخ احمد نے تفسیر کبیر امام فخر الدین رازی سے نقل کیا ہے۔

ومن المنهزن عمر رضى الله تعالىٰ عنه اكله نه لم يكن فى اوايل المنهم من ولم يبعدبلى ثبكت على الجبل و منهم ايضاً عثمان رضی اللہ عنہ رجلين يقال لهما سعدو عقبة انهرموا بعيداً ثم رجعوا بعد ثلثة ايام۔

یعنی گریز کرنے والوں میں حضرت عمرؓ بھی تھے مگر یہ کہ وہ ابتداء میں نہیں بھاگے تھے اور دور نہیں گئے تھے بلکہ میدان جنگ سے ہٹ کر پہاڑی پر رکے رہے نیز گریز کرنے والوں میں حضرت عثمان بھی تھے۔ جو سعد اور عقبہ کے ساتھ دور چلے گئے تھے اور تین دن کے بعد واپس آئے۔

تفسیر کبیر کا مرتبہ تفاسیر میں اور اس تفسیر کے مفسر کا مرتبہ علماء و مفسرین میں حضرات اہل سنت کے یہاں ایسا بلند اور عظیم ہے کہ اس تفسیر اور مفسر کی کوئی مثال نہیں ہے۔

پھر علامہ ابن اثیر جزری کی تاریخ کامل سے تاریخ احمدی نے یہ عبارت نقل کی ہے۔

انتهت الحريمة بجماعته من المسلمين فيهم عثمان بن

عفان وغيره الى الاعومن ناقاموا به ثلاثا ثم اتوا بنيٌ فقال لهم جان راهم لقد ذهيتم وفيها يفة۔

یعنی ہزیمت یافتہ مسلمانوں نے جن میں حضرت عثمان بن عفان بھی تھے موضع اعوض میں جا کر قیام کیا اور وہاں سے تین دن کے بعد رسول مقبولؐ کی خدمت میں واپس آئے جن کو دیکھ کر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم لوگ بہت دور چلے گئے تھے۔

اسی طرح شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کتاب مدارج النبوۃ میں تاریخ مذکور سے یہ عبارت تحریر کی ہے۔

"اصحاب درآن حسن بر چہار قسم شاندار جمع جنگ کردند یا شہید شاند، گرہ ہے گر بغتند ودرزاویا و شعاب جبل مخفی گشتند وبعضی بہ شہر رفتند وقرار گرفتند وعثمان بن عفان ازا نجمہ ہود"

اصحاب رسولؐ اس وقت (جنگ احد میں) چار قسم پر ہو گئے۔ ایک نے تو جنگ کی، دوسرے وہ لوگ جو شہید ہو گئے۔ تیسرا وہ گروہ تھا جو بھاگ کر پہاڑ کی گھاٹیوں میں چھپ گیا۔ چوتھا گروہ شہر پہنچ گیا اور وہیں ٹھہرا رہا اور عثمان بن عفان اسی چوتھے گروہ میں سے تھے۔

معرکہ خیبر میں بالآخر علم لشکر سرکارؐ نے علیؑ کو دیا اور فتح نصیب ہوئی

غزوہ خیبر، غزوہ خندق اور غزوہ حنین مشہور ترین غزوات ہیں۔

غزوہ خیبر میں خلیفہ اوّل و خلیفہ ثانی ہر دو حضرات علم لشکر لے گئے تھے اور یہ مسلم ہے کہ دونوں حضرات فتح نہ کر سکے اور بے مراد واپس آئے۔ آخر کار سرکارؐ نے علیؑ کو طلب فرمایا جو اس وقت تک آشوب چشم کی شدید تکلیف میں مبتلا تھے۔ سرکارؐ نے اپنا لعاب دہن ان کی آنکھوں میں لگایا اور اس سے ان کے صحت یاب ہونے پر علم دے کر بھیجا تو ہر مہم سر ہوئی۔

سرکارؐ نے علیؑ کو علم دیئے جانے کا ذکر ایک روز پہلے فرمایا تھا۔ لیکن اس ذکر میں علیؑ کا نام نہیں لیا تھا بلکہ علم پانے والے کے صفات و علامات بتاتے ہوئے فرمایا:

لاعطين الرية غداً رجلاً كراراً غير فرارٍ يحب الله و رسول و يحبه الله ورسوله يرجع حتى يفتح الله على ايديه.

یعنی کل رایت (سب سے بڑا علم) میں اُس کو دوں گا جو کرار غیر فرار اور اللہ اوراس کے رسولؐ کو دوست رکھتا ہے اور اللہ اور اس کا رسولؐ اس کو دوست رکھتے ہیں وہ فتح کے بغیر واپس نہ آئے

گا۔

صاحب صحیح بخاری نے بھی اس حدیث کو بیان فرمایا ہے۔

جنگ حنین کے بارہ میں قرآنی بیان

غزوہ حنین کا تذکرہ خود حنین کا نام لے کر قرآن کریم نے کیا ہے۔

ويوم حنين اذا عجبتكم كثرتكم فلم تغن عنكم شيئا و ضاقت عليكم الارض بمارحبت ثم وليتم مدبرين

سورۃ توبہ آیت 25

''یعنی جنگ حنین میں جب کہ تم کو (مسلمانوں کو) اپنی کثرت پر ناز تھا لیکن زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگ گئے۔''

صحیح بخاری سے تاریخ احمدی نے نقل کیا ہے۔

14- عن ابی قتادہ قال انهزم المسلمون والنهرمت معهم فاذا بعمر بن خطاب فی الناس قتلت له ماشان الناس قال امر الله ثم.

ابو قتادہ صحابی بیان فرماتے ہیں کہ حنین میں مسلمان پسپا ہو

کر بھاگ گئے تو ان میں ایک میں بھی تھا۔ نا گاہ میں نے دیکھا کہ ہم لوگوں میں عمر بن خطاب بھی ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ ہم لوگوں کا کیا حال ہو گا۔ تو انہوں نے فرمایا کہ حکم اللہ (غالباً خیرو شر کا سکہ یہیں سے چلا) پھر لوگ رسولؐ کی طرف واپس آ گئے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کتاب ازالتہ الخفا میں لکھا ہے۔

درغزوہ حنین چوں حزیمت بہ مسلمین روداد (علی) رضی اللہ تعالیٰ عنہ ازجماعت ثابتان بود۔

''یعنی غزوہ حنین میں مسلمان پسپا ہو کر بھاگے تو حضرت علیؑ اپنی جگہ سے نہیں ہٹے۔ بلکہ وہ ان لوگوں میں تھے جو ثابت قدم رہے۔

اب ہم کنز العمال کی عبارت لفظ بہ لفظ تاریخ مذکورہ سے نقل کرتے ہیں۔

جنگ حنین میں کون ثابت قدم رہا۔

اخرج ابن عساکر عن حسین بن علی قال کان ممن ثب مع رسول اللہ یوم حنین العباس و علی بن ابی طالب و ابو سفیان بن الحارث و عقیل بن ابی

یعنی ابن عساکر نے حسین بن علیؑ سے روایت کی ہے روز حنین جو لوگ رسولؐ کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ وہ عباس عم رسولؐ اور علیؑ ابن ابی طالبؑ اور عبداللہ بن زبیر اور زبیر بن عوام اور اسامہ بن زید ہیں۔

علامہ حلبی سیرت حلبیہ میں بیان فرماتے ہیں۔

ولی روایۃ لما فرالناس یوم حنین عن النبی لم یبو معہ الا اربعۃ ثلاثۃ من بنی ہاشم ورجل غیر ہم۔ علی بن ابی طالب والعباس ابو سفیان الحارث وابن مسعود۔

''یعنی ایک روایت میں آیا ہے کہ جب لوگ رسولؐ کو چھوڑ کر جنگ سے بھاگے تو سوائے چار آدمیوں کے کوئی باقی نہ رہا تین تو بنی ہاشم سے تھے! ایک علی بن ابی طالبؑ دوسرے عباسؓ تیرے ابو سفیان جو (حضرت عبدالمطلب کے پوتے تھے) چوتھے ابن مسعود (غیر ہاشمی)

جنگ احد سے جو لوگ میدان جنگ سے ہٹ کر قریب یا دور چلے گئے ان کے لیے قرآن نے اگرچہ ان کے جرم کے بالکل بخشے جانے کا ذکر تو نہیں کیا کیونکہ لفظ مغفرت نہیں کہا گیا۔ تاہم ان کے لیے قرآن کریم لفظ عفو کا استعمال ضرور کہتا ہے۔ جس کے معنی ہیں درگزر اور چشم پوشی لیکن جنگ حنین سے چلے جانے والوں کے لیے قرآن کریم میں لفظ عفو بھی میری نظر سے نہیں گزرا۔

بہر حال ان تمام واقعات کا ذکر کرنے کا میرا مقصد کسی کی غلطیوں کو ظاہر کرنا نہیں بلکہ یہ بتانا ہے کہ شیعہ جن صحابہ کا احترام نہیں

کرتے اُن کی ایسی کون سی باتیں یا عمل تھے پھر یہ تو صرف آغاز ہے
صرف یہ بتانا مقصد ہے کہ یہ غلطیاں تو تب ہوئیں جبکہ یہ صحابہ نبیؐ کے
ساتھ تھے اُن کا ساتھ اور اُن کی مسلسل تربیت کے باوجود غلطیاں سرزد
ہوئیں تو آپؐ کے وصال کے بعد کے واقعات وہ ہیں جن کی بنا پر اہل
تشیع چند صحابہ کو نہیں مانتے۔ یا کہ اُن کا احترام نہیں کرتے۔

مرض الموت میں نبیؐ کی طرف سے کسی ہدایت نامہ کے لکھنے کا ارادہ

یہ واقع کسی غیر مستند کتاب یا کسی شیعہ کی کتاب سے نہیں ہے
بلکہ صحیح بخاری تک میں موجود ہے کہ سرکارؐ نے کسی نوشتہ ہدایت کو انجام
دینے کے لیے سامان تحریر طلب کیا اور فرمایا کہ وہ تحریر اس لیے کر رہا
ہوں کہ تم میرے بعد گمراہ نہ ہوسکو اس واقعہ کو طبرانی نے خود حضرت عمرؓ
کی زبانی بیان کیا ہے۔

عن عمر لما برض النبی صلعم ال ادعوالی الصحیفة
وداته اکتب کتابالا نصلو بعدی ابد فقال السنوته
من وراء السراء تسمعون ما یقول رسول الله فقلت
انتن صواحب یوسف اذا مرض رسول الله عصرتن
اعینکن واذصع رکتین عنقه فقال رسول الله

وھوھن فانھن خیر منکم

''حضرت عمر نے فرمایا کہ جب نبیؐ بیمار ہوئے تو فرمایا کہ مجھے
کاغذ اور دوات دو تو میں تمہارے لیے وہ نوشتہ تحریر کروں جس
سے تم میرے بعد کبھی گمراہ نہ ہو(لیکن اس کی تعمیل نہ ہوتے دیکھ
کر) پردے سے مستورات نے کہا کہ کیا تم لوگ نہیں سن رہے
ہو جو رسولؐ کہہ رہے ہیں تو میں نے ان مستورات سے کہا کہ تم
مواجب یوسف ہو(یعنی فریب دینے والی ہو) تمہارا حال یہ ہے
کہ جب نبیؐ بیمار ہوتے ہیں تو تم آنسو بہاتی ہو اور جب نبیؐ اچھے
ہوتے ہیں تم ان کی گردن پر سوار ہو جاتی ہو۔ اس پر رسولؐ نے
فرمایا کہ ان (ازواج نبی) سے تعرض نہ کرو یہ تم سے بہتر ہیں۔
بہر حال اس واقعہ کو صحیح بخاری۔ صحیح مسلم مُسند امام احمد بن حنبل
شرح شفا قاضی عیاض وغیرہ بہت سی کتابوں نے بیان کیا ہے کہ
آنحضرتؐ کے اس فرمان پر حاضرین کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک
گروہ اس تحریر کے مخالف تھا اور ایک گروہ اس تحریر کے حق میں
تھا۔ ان دونوں گروہوں میں تُوتُو مَیں مَیں اور لڑائی جھگڑے ہونے
کی نوبت آ گئی تو رسولؐ نے فرمایا کہ میرے پاس یہ لڑائی جھگڑا
کرنا سزاوار نہیں ہے۔ یہ مسلم ہے کہ حضرت عمرؓ اس تحریر کے
سخت مخالف تھے۔ مخالفین تحریر کی بات یہاں تک پہنچ گئی کہ

انہوں نے رسولؐ کی بات کو بے حواسی اور ہذیان تک قرار دے
دیا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس تحریر کی مخالفت کوئی معمولی اور سطحی
مخالفت نہ تھی بلکہ اس پر پوری قوت صرف کی جارہی تھی کہ تحریر
عمل میں نہ آئے۔ اس تحریر کے مخالفین میں حضرت عمرؓ سب سے
آگے تھے۔ علامہ شبلی نے بھی الفاروق میں یہی جُملہ تحریر کیا
ہے۔ ''روایتوں میں ہے کہ حضرت عمر ہی نے آنحضرتؐ کے اس
ارشاد کو ہذیان سے تعبیر کیا تھا۔''

یہاں دو باتیں لائق غور ہیں ایک یہ کہ نبیؐ کا یہ ارشاد کہ دوات
اور کاغذ لاؤ تا کہ میں وہ تحریر دے جاؤں کہ تم کبھی گمراہ نہ ہو۔

یہ خطاب نبویؐ کن لوگوں سے تھا اور اس حکم کی تعمیل کے ذمہ دار
کون لوگ تھے؟ باالفاظ دیگر یہ خطاب محض صحابہ سے تھا یا اس خطاب میں
حضرت علیؑ اور دوسرے افراد اہل بیت علیہم السلام بھی شامل تھے اس کا
فیصلہ خود اس حدیث کے الفاظ کر رہے ہیں۔

لن تضلوا بعدی ابداً۔

یعنی وہ تحریر تم کو ہمیشہ گمراہی سے بچانے والی ہو گی لہٰذا بخوبی
ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ خطاب ان سے نہیں ہے جن کے لیے آیت قرآنی اور
حدیث نبویؐ نے طے کر دیا۔

اولئك عليهم صلوة من ربهم

یہ وہ ہیں جن پر ہمیشہ ان کے رب کی طرف سے صلوات ہے
جن پر درود بھیجنا نماز کا جز ہے۔ جن کی محبت ایمان اور اجر تبلیغ رسالت
ہے جن کے لیے نبویؐ ارشاد ہے۔

العلی مع القرآن مع العلی۔ العلی مع الحق، والحق مع
العلی، فاطمہ بضعتہ فی من آذاھا فقد اذانی من غضبھا
فقد اغضبنی۔ الحسن والحسین سید اشباب اھل
الجنتہ۔ علی قسیم النار والجنة۔

اہل بیت علیہم السلام کے گمراہ ہونے کا تو امکان کیا ہوتا ان کے
لیے نبیؐ کا ارشاد ہے اور یہ ارشاد اس وقت صحابہ کہ سوا کس سے ہو
سکتا ہے کہ میں تم میں دو گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں کتاب
اللہ اور میرے اہل بیت علیہم السلام ان دونوں سے تمسک رکھو گے
تو میرے بعد کبھی گمراہ نہ ہو گے۔

اس حدیث نبوی نے یہ دونوں چیزیں بے نقاب کر دیں کہ گمراہی
کا امکان میرے اہلبیت علیہم السلام کے سوا دوسروں کے لیے موجود ہے
لیکن اہل بیت علیہم السلام کے لیے یہی نہیں کہ وہ خود کبھی گمراہ نہ ہوں گے
بلکہ جو ان سے تمسک رکھے گا وہ کبھی گمراہ نہ ہو گا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ سرکارؐ لکھنا کیا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے
کہ اس تحریر کی مخالفت اور مخالفت بھی غیر معمولی اور پوری طاقت سے بغیر

کسی خاص وجہ کے تو نہیں ہو سکتی تھی۔ مخالفت کرنے والے حضرات اپنی جگہ ضرور سمجھ گئے تھے کہ سرکارؐ کیا لکھیں گے۔ اگر مضمون تحریر سے قطعاً بے خبر ہوتے تو مخالفت کرنے کی بجائے اس تحریر کے دیکھنے اور معلوم کرنے کے انتہائی اشتیاق ہوتے۔ احکام شریعہ جو سب بیان میں آچکے تھے ان کی صریح مخالفت کا تو کسی سے خطرہ نہ تھا سرکارؐ کے بعد سب سے زیادہ مخالفت کا پہلو مسئلہ خلافت ہی کے بارہ میں ہونے کا امکان تھا چنانچہ وفات نبیؐ کے بعد فوری طور پر نبی اکرمؐ کے دفن ہونے سے پہلے ہی ایسا شدید جھگڑا شروع ہو گیا کہ بالآخر اُمت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے کتنے لوگ تدفین نبیؐ میں شرکت سے محروم رہے۔ فاطمہؑ کا گھر جلانے کی نوبت آ گئی۔

علی مرتضیٰؑ کو قتل کرنے کے ارادے ہو گئے۔ سقیفہ میں مار پیٹ اور کچلنے کچلانے کی نوبت آ گئی اور آگے چل کر یہ مسئلہ خلافت تھا جس پر لاکھوں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہہ گیا تھا حاضرین مجلس نبیؐ نے نبوی ارشاد کی حقیقت کو یقیناً سمجھ لیا تھا کہ نبویؐ تحریر میں وہی مسئلہ خلافت آئے گا جو نبوی تقریر میں آچکا ہے۔ یعنی نبیؐ وہی لکھیں گے جو کہہ چکے ہیں۔ حدیث ثقلین کا آخری لفظ اور اس حدیث قرطاس کا آخری لفظ بالکل ایک تھا۔ وہاں بھی یہ فرمایا تھا۔ قرآن اور اہل بیت علیہم السلام سے تمسک رکھو گے تو میرے بعد کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ حدیث قرطاس میں بھی

آخری جملہ یہی ہے کہ اس نوشتہ کی بدولت کبھی میرے بعد گمراہ نہ ہو گے۔ مخالفین تحریر دونوں جگہ یکساں جملہ دیکھ کر باآسانی یہ سمجھ گئے کہ یہ تحریر اہلبیت علیہم السلام کے حق میں ہو گی اور ہمارے خلاف جائے گی۔ پھر سرکار سے وہ تحریر لکھوائی کیوں نہ گئی؟ یہ سوال اکثر ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو جب نبیؐ کی موجودگی ہی میں یہ کہہ دیا جائے کہ رسولؐ اس وقت اپنے حواس میں نہیں ہیں اور جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ یہ بات ہوش و حواس کی نہیں ہے تو رسولؐ کے بعد اس تحریر کو سند کون دیتا؟ اگر تحریر ہو بھی جاتی تو اس کا فائدہ کیا تھا؟ بڑی آسانی سے کہا جاتا کہ ہم تو اسی وقت کہہ چکے تھے کہ رسولؐ بے حواس ہیں بہ بے حواسی کی تحریر کیوں مانی جائے۔

غرض کہ تحریر تو نہ ہو سکی لیکن اہل بیت علیہم السلام اور ان مخصوص صحابہ کے درمیان منافرت و مخالفت کی بنیاد اگر پہلے سے کچھ کمزور بھی تھی تو اب پختہ ہو گئی۔

وفات رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کیا واقعات پیش آئے؟

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دفن کا انتظار کئے بغیر صحابہ کا اجتماع مسجد نبوی کو چھوڑ کر سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوا کیوں؟ تاکہ مسئلہ خلافت کو طے کر لیا جائے اس اجتماع کے لیے پہل کس طرف سے ہوئی؟ بعض لوگ انصار کا نام لیتے ہیں اور ان کو طالب خلافت قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ بات یاد رکھئے کہ سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوات وقلم و کاغذ طلب کرنے اور ہدایت نامہ کے لکھنے کے ارادہ پر کسی انصار کا نام مطلقاً نہیں آتا کہ مخالفت کی ہو۔ اس کے علاوہ تاریخ کامل ابن اثیر کا یہ جملہ ملاحظہ فرمایئے۔

فبایعه عمر و بایعه الناس وقالت الانصار وبعض الانصار لانبایع الا علیاً۔

یعنی حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کی حضرت عمرؓ نے اور دوسرے لوگوں نے لیکن کل انصار نے یا بعض انصار نے کہا کہ ہم علیؑ کے سوا کسی کی بیعت نہ کریں گے۔

حقیقتاً انصار مدینہ کو یہ جسارت ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ وہ آپ ہی

آپ مسئلہ خلافت کو طے کر لیں۔ خصوصاً نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کے بعد کہ خلافت میرے ہی خاندان سے وابستہ رہے گی۔ انصار مدینہ کو علی مرتضیٰؑ سے کوئی مخالفت ہی نہ تھی کیونکہ انصار سے تو کوئی جہاد ہوا ہی نہ تھا جو علیؑ کی تلوار سے ان کو کوئی شکایت ہوتی۔ علی مرتضیٰؑ کے زمانہ خلافت میں صرف مکہ کے مسلمانوں نے علیؑ سے جدال وقتال کا بازار گرم کیا اور آپؑ کی خلافت کا تختہ الٹنا چاہا لیکن انصار نے حضرت علیؑ کی ہر جنگ میں دل کھول کر حمایت کی۔ اس لیے یہ بات درست نہیں ہے کہ سقیفہ میں انصار پہلے پہنچ گئے تھے۔ مختصر یہ کہ یہ صحابہ حضرت ابو بکر اور عمر فاروق ؓ اور اُن کے ساتھی سقیفہ بنی ساعدہ میں شمولیت کی وجہ سے تدفین رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں شریک نہ ہو سکے اور حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کر کے ان کے لیے منصب خلافت قائم کر دیا۔ ان حضرات کی جنازہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں عدم شرکت اور اہل بیت علیہم السلام کی عدم موجودگی میں انعقاد خلافت ایسی چیزیں تھیں جن سے اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو، جو صاحبان میت تھے، سخت صدمہ پہنچا اور باہمی خلیج منافرت مزید وسیع ہو گئی۔ علی مرتضیٰؑ نے بھی ان دونوں چیزوں کی (عدم شرکت جنازہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور انعقاد خلافت کی) صحابہ سے شکایت کی اور حضرت فاطمہ زہرہ علیہا السلام نے بھی دروازہ پر آ کر، جب کہ صحابہ باہر کھڑے تھے، فرمایا:

فوقفت فاطمة رضی الله عنها علی بابها وقالت ترکتم رسول الله جنازة بین ایدینا و قطعتم امرکم بینکم ولم تروالنا حقاً۔

(کتاب الامامة والسیاته)

یعنی فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے اپنے دروازہ پر کھڑے ہو کر فرمایا کہ تم لوگوں نے نعش مقدس رسول ﷺ کو ہمارے ہاتھوں میں چھوڑ دیا اور امر خلافت کو باہم طے کرلیا اور یہ مطلقاً نہ دیکھا کہ یہ ہمارا حق ہے۔ سنی المطالب شمس الدین جزری میں فاطمہ زہرا علیہا السلام کے یہ الفاظ مندرج ہیں۔

ان فاطمة بنت رسول الله قالت انسیتم قول رسول الله یوم غدیر خم من کنت مولاه فعلی مولاه وقوله انت منی بمنزلة هارون من موسی۔

یعنی فاطمہ بنت رسول علیہا السلام نے فرمایا کہ لوگو! کیا تم رسول اللہ ﷺ کا یہ قول بھول گئے ہو؟ جو آپ ﷺ نے غدیر خم پر فرمایا تھا کہ جس کا میں مولا ہوں پس اس کے علیؑ مولا ہیں اور آنحضرت ﷺ کا یہ قول کہ یا علیؑ تم مجھ سے اسی منزلت پر ہو جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی۔

غرض کہ صحابہ مذکورین اور علیؑ و فاطمہ علیہا السلام کے مابین پے درپے ایسے واقعات ہوتے رہے جو باہمی منافرت اور غم و غصہ کو بڑھا رہے تھے۔ ان سب کے بعد جو واقعہ رونما ہوا وہ اپنی جگہ قیامت خیز تھا۔ حضرت ابو بکر کی خلافت تو بیعت عامہ سے قائم ہو چکی تھی۔ اب حضرت عمرؓ کا خلیفہ وقت سے یہ اصرار تھا کہ بنی ہاشم خصوصاً علیؑ سے بھی بیعت لی جائے اور ان کو بالجبر گرفتار کر کے لایا جائے۔ واقعہ یہ تھا کہ بنی ہاشم اور ان کے علاوہ صحابہ کی ایک جماعت علیؑ کو منصب خلافت کا حق دار قرار دیتے تھے۔ اور حضرت ابو بکر کی بیعت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ تاریخ ابو الفداء میں ہے۔

وخلا جماعة من بنی هاشم الزبیر والمقداد بن عمر و سلمان الفارسی و ابوذر و عمار بن یاسر والبراء بن عازب وغیرهم مالوا مع علی بن ابی طالب۔

یعنی صحابہ کی ایک جماعت جو علیؑ بن ابی طالبؑ کی طرفدار تھی، بیعت ابی بکر سے کنارہ کش تھی۔ یہ لوگ بنی ہاشم کے علاوہ زبیر، مقداد بن عمر، سلمان فارسی، ابوذر، عمار بن یاسر، برا ابن عازب وغیر ہم تھے۔ (تاریخ الفداء)
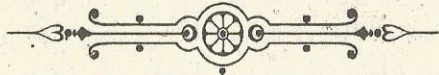
حضرت علیؑ سے زبردستی بیعت

حضرت عمرؓ کے اس اصرار پر کہ علیؑ سے بزور بیعت لی جائے۔ حضرت ابو بکر خاموش تھے اور حضرت عمرؓ کی رائے پر عمل کرنے کو خطرناک سمجھتے تھے۔ ان کو اندازہ تھا کہ علیؑ ہرگز بیعت نہ کریں گے بلکہ بیعت کرنے کی بجائے خود اپنے لیے حق خلافت ثابت کریں گے۔ لیکن حضرت عمر کی جو شدید رائے تھی اس کے سامنے حضرت ابو بکر کی بات چل نہیں سکتی تھی۔ اگرچہ یہ واقعہ اس قسم کی تمام ہی کتابوں میں مذکور ہے مگر میں صرف مورخ ابن قیتبہ کی تاریخ سے وہ عبارت نقل کر رہی ہو جس کو تاریخ احمدی نے بیان کیا ہے۔

فاتی عمر ابا بکر فقال له الا تاخذ هذا المتخلف عنك بالبیعة فقال ابو بکر القنفذا وهو مولی له اذهب فادع بی علیاً فذهب الی علی فقال له ما حاجتك فقال یدعوك خلیفة رسول الله فقال علی لسریع ما کذبتم علی رسول الله فرجع فابلغ الرسالة قال فبکی ابو بکر طویلا فقال عمر الثانیة ان لا تمهل هذا

المتخلف عنك بالبیعة فقال ابو بکر رضی الله عنه لقنفذا عدالیه فقل له امیر المومنین یدعوك لتبایع فجائه قنفذ فادی ما امر به فرفع علی صوته فقال سبحان الله لقد ادنی ما لیس له فرجع قنفذ فابلغ الرسالة فبکی ابوبکر طویلا ثم قام عمر و مشی معه جماعة حتی آتوا اباب فاطمة فدقوالباب فلما سمعت اصواتهم نادت باعلی صوتها باکیة یا ابت یا رسول الله ماذا یقینا بعدك من ابن ابی قحافة فلما سمع القوم صوتها وبکائها الضرفوا باکین و بقی عمر و معه قوم فخرج علی منی معهم الی ابن بکر فقالو له بایع فقال ان فالم افعل قالوا اذاً والله الذی لا اله الا هو فضرب منقك قال اذاً تقتلون عبدالله واخارسوله قال عمر امّا عبدالله فنعم واما اخورسوله فلا و ابو بکر ساکت لا یتکلم فقال له عمر الاتامرفیه بامرك فقال لااکرهه علی شئی ماکانت فاطمة الی جنبه فلحق علی بقبر رسول الله

یضیح ویبکی وینادی یابن عم ان القوم
استضعفونی وکادوا ان یقتلونی۔

یعنی حضرت عمرؓ حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے اور کہا کہ یہ
شخص (علیؑ) جو تمہاری بیعت سے پیچھے ہٹ رہا ہے اس کو کیوں
نہیں پکڑتے۔ اس پر ابو بکر نے اپنے غلام قنفذ سے فرمایا کہ
میرے پاس علیؑ کو لے آؤ۔ قنفذ علیؑ کے پاس گیا اور کہا کہ تم کو
خلیفہ رسول اللہ بلاتے ہیں۔ علیؑ نے کہا کہ تم لوگوں نے
رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بہت جلد جھوٹ بولا (کیونکہ خلیفہ رسول اللہ کے
معنی ہیں رسول اللہ کا بنایا ہوا جانشین) قنفذ نے واپس جا کر یہ
بات پہنچادی۔ اس پر حضرت ابو بکر دیر تک روتے رہے۔ حضرت
عمرؓ نے دوبارہ کہا کہ اس شخص (علیؑ) کو، جو تمہاری بیعت نہیں کر
رہا ہے، مہلت نہ دو۔ حضرت ابو بکر نے قنفذ سے کہا کہ دوبارہ
جاؤ اور علیؑ سے کہو کہ امیر المومنین تم کو بیعت کے لیے بلاتے
ہیں۔ قنفذ پھر علیؑ کے پاس آیا اور جو کہلایا گیا کہا تو علیؑ نے اپنی
آواز کو بلند کیا اور کہا کہ سبحان اللہ! ابو بکر نے اپنے لیے اس چیز کا
دعویٰ کیا جو اس کے لیے سزاوار نہیں۔ قنفذ نے واپس آکر یہ
بات بھی حضرت ابو بکر سے کہہ دی جس پر حضرت ابو بکر دیر تک
روتے رہے۔ پھر حضرت عمرؓ خود کھڑے ہو گئے اور ایک جماعت

کے ساتھ یہ لوگ فاطمہ علیہا السلام کے دروازے پر پہنچے اور
دروازہ کھٹکھٹایا۔ فاطمہ زہرا علیہا السلام نے جب ان لوگوں کی
آواز سنی تو نہایت اونچی آواز سے روتے ہوئے پکاریں اے بابا!
اے رسول اللہ! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ہم کو ابو قحافہ اور خطاب کے
بیٹوں کے ہاتھوں کیا کیا مصیبتیں پہنچ رہی ہیں۔ قوم نے جب
فاطمہ زہرا علیہا السلام کی آواز سنی اور ان کے رونے کی آواز کو سنا
تو کچھ روتے ہوئے واپس چلے گئے۔ حضرت عمر اور ان کے ساتھ
کچھ لوگ اسی طرح کھڑے رہے۔ پس علیؑ نکلے اور ان لوگوں کے
ساتھ حضرت ابو بکر کی طرف چلے تو ان لوگوں نے علیؑ سے کہا کہ
بیعت کرو۔ علیؑ نے کہا کہ اگر میں ہرگز بیعت نہ کروں تو؟ پس
ان لوگوں نے کہا کہ اس صورت میں اس اللہ کی قسم جس کے سوا
کوئی معبود نہیں، آپؑ کی گردن مار دیں گے۔ علیؑ نے کہا مجھے قتل
کرو گے تو تم لوگ ایک بندہ خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھائی
کے قاتل ہو گے۔ اس پر عمر نے کہا کہ تم بندہ خدا تو ہو مگر رسول
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھائی نہیں ہو (حالانکہ کہ یہ مسلم ہے کہ سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
نے مکہ اور مدینہ میں دونوں مرتبہ بھائی چارہ قائم کرتے ہوئے
فرمایا کہ علیؑ! تم میرے بھائی ہو دنیا اور آخرت میں۔)

حضرت ابو بکرؓ بالکل خاموش تھے اور کوئی بات نہیں کر رہے

تھے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ تم اس شخص کے بارے میں اپنا کوئی حکم کیوں نہیں دیتے؟ تو حضرت ابوبکر نے جواب دیا کہ میں علیؑ کو کسی بات پر اس وقت تک مجبور نہ کروں گا جب تک فاطمہ علیہا السلام موجود ہیں۔ علیؑ وہاں سے چیخ چیخ کر روتے ہوئے قبر رسول ﷺ پر آئے اور فریاد کرنے لگے کہ اے بھائی (رسول اللہ ﷺ)! قوم نے مجھے ناتواں کر دیا اور قریب تھا کہ قتل کر دیں۔

بات اسی پر ختم نہیں ہوتی۔ قتل کی دھمکی تو آپ سن چکے اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔

عقد الفرید (شہاب الدین ابن عبدربہ اندلسی) اور تاریخ ابو الفداء اور تاریخ طبری (ابوجعفر بن جریر) اور کتاب الامامتہ والسیاستہ (ابن قتیبہ دینوری) اور زمانہ حال کی کتاب الفاروق (علامہ شبلی) وغیرہ میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ حضرت عمر آگ اور لکڑیاں لے کر خانہ سیدہ علیہا السلام پر آئے اور فرمایا کہ تم لوگ یہاں سے نکل کر ابوبکر کی بیعت کرو ورنہ میں اس گھر کو جلادوں گا۔ لوگوں نے کہا کہ اس گھر میں تو فاطمہ علیہا السلام بھی ہیں۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ ہوں۔ حضرت فاطمہ علیہا السلام نے دروازہ پر آ کر کہا: اے پسر خطاب! کیا تو میرے گھر کو جلانے کے لیے آیا ہے؟ حضرت عمرؓ نے کہا ہاں۔

یہ سب کچھ ہوا لیکن یہ مسلم ہے کہ اس مرحلہ پر کسی طرح بھی علیؑ

نے بیعت نہ کی اور یہی کہتے رہے کہ

لا ابایعکم وانتم اولی بالبیعۃ لی۔

میں تمہاری بیعت نہ کروں گا۔ البتہ تم کو میری بیعت کرنا چاہیے۔ قصہ مختصر یہ کہ علیؑ و فاطمہ علیہا السلام نے خلافت حضرت ابوبکر کو تسلیم نہ کیا۔ اب اِن تمام تر واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ ان افراد نے فاطمہؑ و علیؑ کو کس قدر دُکھ پہنچائے اور بات یہیں ختم نہیں ہوتی آگے چل کر غم و غصہ اور عداوت کی آگ کے شعلے بہت زیادہ بھڑک گئے۔ اور بی بیؑ کو اُن کے والد کی دی ہوئی وراثت سے محروم کر دیا گیا۔ اس واقع کو قضیہ باغ فدک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ میں مختصراً بیان کروں گی کہ جائداد کیسے نبیؐ کے پاس آئی اور بی بیؑ کا حق تھی۔
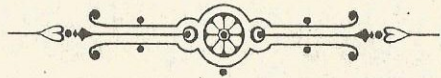
مسئلہ فدک کا آغاز

حقیقت فدک اور اس کے متعلق ضروری امور:

کفار کے قبضہ سے حاصل ہونے والے علاقوں کی قرآن مجید نے دو الگ الگ قسمیں قرار دی ہیں ایک وہ جس کو مسلمانوں نے جہاد کر کے فتح کیا دوسرا وہ جو بغیر جنگ کے کفار نے بطور صلح خود بانیٔ اسلام کو پیش کیا۔ مالک الملک نے اسی دوسرے علاقہ کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی ملکیت قرار دیا۔ چنانچہ علاقہ فدک جس کو ایک گاؤں کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے بنی نضیر کے یہودیوں نے بغیر جنگ کے پیش کیا اور قرار دادِ قرآنی سے خالصہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرار پایا۔ اب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی الٰہی نازل ہوئی۔

وآت ذا القربی حقه۔

یعنی اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! قرابت دار کو ان کا حق دے دو۔

فدک نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فاطمہ زہرا علیہا السلام کو ہبہ کیا:

حکم خدا پر سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ علاقہ فاطمہ زہرا علیہا السلام کو ہبہ کر دیا۔ چنانچہ علامہ سیوطی اپنی تفسیر در المنثور میں لکھتے ہیں جس کو میں

تاریخ احمدی سے نقل کر رہی ہوں۔

والدر المنثور للسیوطی اخرج البزار وابو یعلی و ابن ابی حاتم عن ابی سعید الخدری قال لما نزلت وآت ذاالقربی حقه دعا رسول الله فاطمة فاعطاها فدك و عن ابن عباس قال لما نزلت وآت ذاالقربی حقه اقطع رسول الله فاطمة فدك۔

یعنی علامہ سیوطی نے اپنی تفسیر درمنثور میں بیان کیا ہے کہ بزار اور ابو یعلی اور ابن حاتم نے ابو سعید خدری صحابی رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روایت کی ہے کہ جب آیت

ذاالقربی حقه

نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فاطمہ علیہا السلام کو فدک دے دیا اور ان کو مستقل طور پر منتقل کر دیا۔

وفات رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک فدک پر سیدہ علیہا السلام کا قبضہ رہا:

تا حیات پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ علاقہ فاطمہ زہرا علیہا السلام کے قبضہ و تصرف میں رہا۔ چنانچہ حضرت علی مرتضیٰؑ نے اپنے زمانہ خلافت میں جو مکتوب اپنے عامل بصرہ عثمان بن حنیف انصاری کے نام تحریر کیا اس میں امیر المومنینؑ نے عثمان بن حنیف کو ہدایت کرتے ہوئے کہا کہ کبھی

زخارف دنیا پر فریفتہ نہ ہونا اور مال دنیا پر حریص نہ ہونا۔ خود اپنی زندگی کے حالات لکھے کہ میں نے کبھی اچھا کھانے کا شوق نہ کیا نہ اچھا پہننے کا، نہ مال دنیا کے جمع کرنے کا نہ کسی مال کو بچا بچا کر رکھنے کا۔ اس سلسلے میں سرکار امامت نے یہ جملہ تحریر فرمایا۔

بلی كانت فی ایدینا فدك من كل ما اظلته السماء فشحت علیها نفوس قوم و سخت عنها نفوس قوم آخرین و نعم الحكم الله۔

یعنی ہمارے پاس کبھی کوئی مالی ذخیرہ نہیں رہا۔ البتہ آسمان کی تمام وسعتوں کے نیچے یعنی ساری دنیا میں محض ایک فدک ہمارے ہاتھوں میں تھا لیکن افراد قوم نے ہمارے حق کے بارے میں بخل اختیار کیا تو ہم نے اس کو بھی اپنی سیر چشمی کی بناء پر خیر باد کہہ دیا (یعنی) اتمام حجت کرنے کے بعد بزور حاصل کرنے کی کوشش نہ کی اس کا بہترین فیصلہ اللہ کرے گا۔ علی مرتضیٰؑ کے اس مکتوب کے یہ جملے نہج البلاغہ میں موجود ہیں اور نہج البلاغہ کے کلام علی مرتضیٰؑ ہونے کو ثقات علماء اہل سنت نے تسلیم کیا ہے اور شرحیں لکھی ہیں۔ ان جملوں سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ فدک تا وفات نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اہل بیت علیہم السلام کے قبضہ میں تھا۔ یہاں تک کہ

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوگئی۔

واقعات مابعد وفات نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

وفات نبی کے ہوتے ہی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجہیز و تکفین و تدفین کا انتظار کئے بغیر، سقیفہ کی کارروائی شروع ہوگئی اور قرار داد خلافت کی مصروفیت نے اکابر صحابہ کو دفن رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں شرکت کا موقع نہ دیا۔ اس نازک اور ضروری موقع پر ایسے قریب تر رہنے والے حضرات کی عدم شرکت پر علماء ملت نے حیرت کا بھی اظہار کیا ہے اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس عدم شرکت کے اسباب کو معقولیت دینے کی بھی کوشش کی ہے۔ چنانچہ علامہ شبلی نے الفاروق میں اپنے مخصوص انداز کے ساتھ حضرت ابو بکر اور حضرت عمرؓ کے جنازہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں شریک نہ ہونے کی وجوہ بیان کی ہیں۔

تاریخ الخمیس میں بھی اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

فلما فرغ ابو بکر من البیعة رجع الی المسجد فقعد علی المنبر فبایعه الناس حتی امسی و شغلوا عن دفن رسول الله۔

یعنی جب سقیفہ میں حضرت ابو بکر کو بیعت سے فراغت ہوئی تو مسجد میں آ کر منبر پر بیٹھ گئے اور لوگ شام تک ان کی بیعت

کرتے رہے اور اس وجہ سے یہ حضرات رسول ﷺ کے دفن میں شریک نہ ہو سکے۔

کنزالعمال (شیخ علی متقی القادری الچشتی) میں بیان کیا گیا ہے۔

ان ابا بکر و عمر رضی اللہ عنہما لم یشھد دفن النبی و کان فی الانصار فدفن قبل ان یرجعا۔

یعنی حضرت ابو بکر وحضرت عمر رضی اللہ عنہما دفن نبی ﷺ میں مطلقاً شریک نہیں ہوئے وہ دونوں حضرات مجمع انصار کے ساتھ تھے۔ آنحضرت ﷺ ان دونوں کی واپسی سے پہلے ہی مدفون ہوئے۔ بہر حال صورت یہی رہی کہ ادھر نبی ﷺ دفن ہو رہے تھے اور ادھر حضرت ابو بکر کی بیعت ہو رہی تھی۔ جب بیعت کی مہم سر ہو چکی اور اس طرف سے فراغت ہوئی تو حضرت عمر کے اصرار پر علی مرتضیٰؑ اور ان کے خاندان اور حامیان سے بھی بیعت کا مطالبہ ہو اور اس سلسلہ میں جو تشدد کے واقعات پیش آئے، میں مختصراً بیان کر چکی ہوں لیکن علی مرتضیٰؑ اور بنی ہاشم میں سے کسی نے بھی بیعت نہ کی۔ نتیجتاً فاطمہ زہرا علیہا السلام کے کارکن جو فدک میں تھے، ان کو نکال دیا گیا یہاں سے اس قضیہ کی ابتداء ہوئی۔

سیدہ علیہا السلام نے دعویٰ کیا کہ فدک میرے باپ ﷺ مجھے ہبہ کر چکے ہیں

فتوح البلدان بلاذری جو اکابر علما اہل سنت سے ہیں اور علامہ شبلی نے جا بجا اس کتاب کو سنداً پیش کیا ہے۔ اس کی عبارت ملاحظہ ہو جس کو تاریخ احمدی سے نقل کر رہی ہوں۔

كانت فدك لرسول الله خاصةً لانه لم يوجف المسلمون عليها بخيل ولا ركاب وعن مالك بن جعونه عن ابيه قال قالت فاطمة لابی بكر ابن رسول الله جعل لی فدك فاعطنی اياها و شهد لها علی بن ابی طالب فسالها شاهداً آخر فشهدت لها ام ايمن فقال قد علمت يا ابنة رسول الله انه لا تجوز الا شهادة رجلين او رجل وامرئتين۔

یعنی فدک خاص رسول اللہ ﷺ کا تھا کیوں کہ اس پر مسلمانوں نے نہ گھوڑے دوڑائے تھے نہ اونٹ اور مالک بن جعونہ سے روایت ہے جو انہوں نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ فاطمہ علیہا السلام نے ابو بکر سے کہا کہ فدک مجھ کو میرے باپ ﷺ دے گئے ہیں لہٰذا وہ مجھے دو۔ فاطمہ علیہا السلام کی شہادت علیؑ نے دی۔ حضرت ابو بکر نے دوسرا گواہ طلب کیا تو ام ایمن نے گواہی دی تو حضرت ابو بکر نے فرمایا کہ اے بنت رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ جانتی ہیں کہ شہادت نہیں چلتی لیکن دو مردوں کی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی۔

سیدہ طاہرہ علیہا السلام کا یہ ارشاد کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فدک مجھے ہبہ کیا ہے، دوسری کتابوں میں بھی موجود ہے۔ کتاب فضیلۃ النجات کا قلمی نسخہ جو ہمارے پاس موجود ہے اس میں علماء اہل سنت کی معتبر کتابوں سے ہبہ فدک کا مفصل واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ ابو بکر جوہری کی کتاب قضیہ فدک سے اور یاقوت حموی شافعی کی کتاب معجم البلدان سے اور ابن حجر مکی کی کتاب صواعق محرقہ سے اور تاریخ آل عباس سے اور کتاب ملل و نحل سے اور علامہ ابن الحدید کے بیان سے ظاہر ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام نے اس کے ثبوت میں کہ میرے باپ نے فدک مجھے ہبہ کیا علی ابن ابی طالبؑ اور ام ایمن کو پیش کیا تو حضرت ابو بکر نے فرمایا کہ شوہر کی گواہی زوجہ کے حق میں نہیں سنی جا سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ شہادت اپنے مفاد کے لیے ہو اور ام ایمن ایک عورت کی گواہی لائق اعتبار نہیں اور اس بناء پر انہوں نے فدک کو بنت خیر المسلمین کے تصرف سے نکال کر داخل بیت المال کر دیا۔

فدک کو حضرت ابو بکر نے اور ان کے بعد حضرت عمرؓ نے

اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔

تاریخ الخلفاء علامہ جلال الدین سیوطی شافعی سے اور الفاروق (علامہ شبلی نعمانی) سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ فدک کو حضرات شیخین نے اپنے اپنے عہد میں اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔

اب میں مختصر سا تبصرہ اس امر پر کرتی ہوں کہ آیا اس کی ضرورت تھی کہ فاطمہ زہرا علیہا السلام سے شہادت طلب کی جائے اگرچہ اس سلسلہ میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ فاطمہ زہرا علیہا السلام کا عنداللہ و عندالرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا مقام ہے ان کے بارہ میں آیت تطہیر بتا چکی تھی کہ وہ طاہرہ ہیں اور آیہ مباہلہ نے۔

فنجعل لعنة الله على الكاذبين

کہہ کر بتا دیا تھا کہ وہ صدیقہ ہیں اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ثقلین نے طے کر دیا تھا کہ وہ تمام امت کے لیے وسیلہ نجات ہیں وغیرہ لیکن ہم اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر سیدہ علیہا السلام کو عامتہ المسلمین ہی کی حیثیت سے دیکھیں تو دین اور دنیا کا یہ مستقل قانون ہے کہ قابض سے اثبات حق کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ ثبوت اس سے طلب کیا جائے گا جو اس چیز کا دعویدار ہو کر قابض کے قبضہ سے نکالنا چاہتا ہے اسی لیے یہ جملہ مشہور ہے کہ

القبض وليل الملك

ہاتھ پر گھڑی: جیب میں پیسہ، سر پر ٹوپی، پیر میں جوتا، بدن پر لباس، گھر کا سامان غرض کہ ہر چیز کا ثبوت ملکیت کوئی کہاں تک محفوظ رکھ سکتا ہے؟ اسی وجہ سے شریعت اور ہر حکومت کا قانون ہے کہ بار ثبوت قابض پر نہیں بلکہ اس کے مخالف مدعی پر ہے۔ ہم یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ فدک سیدہ علیہا السلام کے قبضہ میں تھا۔ جس کی ایک اور صریحی دلیل یہ ہے کہ اگر فدک سیدہ علیہا السلام کے قبضہ میں پہلے سے نہ ہوتا تو ان کے اس فرمانے پر کہ میرے باپ نے فدک مجھے ہبہ کیا تھا۔ گواہ طلب کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ جواب دیا جا سکتا تھا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو ہبہ کیا ہوتا تو یہ آپ کے قبضہ میں ہوتا کیونکہ ہبہ قبضہ کے بغیر نافذ ہی نہیں ہوتا۔

سیدہ (علیہا السلام) کی طرف سے شہادت پر ایک نظر:

ممکن ہے کہ کسی کے دل میں یہ خیال گزرے کہ سیدہ علیہا السلام کے گواہوں کا صرف علیؑ اور ام ایمن پر انحصار تھا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف ان دو ہی کے سامنے ہبہ فرمایا تھا؟ اصولاً یہ بات غلط ہے۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ ہبہ کرتے وقت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور ہبہ کا دعویٰ کرتے وقت بنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ علم نہ ہو کہ نصاب شہادت میں کم از کم دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں کا ہونا ضروری ہے اور اس لاعلمی کی وجہ سے سیدہ علیہا السلام نے ناکافی شہادت پیش کی ہو۔

ہم اس کا یقین رکھتے ہیں کہ سیدہ علیہا السلام کی تائید میں شہادتیں اور بھی موجود تھیں۔ چنانچہ تاریخ آل عباس میں یہ بیان موجود ہے کہ سیدہ علیہا السلام نے شہادت کے لیے علی مرتضیٰؑ، ام ایمن اور اسماء بنت عمیس کو پیش کیا اور یہ دونوں خواتین وہ ہیں جن کے لیے سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنت کی بشارت دی۔ یہ روایت اصول درایت کے اعتبار سے یقینی ہے۔ کیونکہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علیؑ اور فاطمہ زہرا علیہا السلام کے بارے میں یہ ہرگز نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ نصاب شہادت سے بے خبر ہوں بلکہ یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ ان تین (یعنی علیؑ، ام یمن اور اسماء بنت عمیس) کے سوا اور کوئی شاہد نہ تھا جس کے سامنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہبہ کیا ہو۔ واقعہ کو واقعہ کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ سیدہ علیہا السلام نے اپنا دعویٰ اس انداز میں نہیں پیش کیا تھا جس طرح ہم لوگ اپنے دعوؤں کو پوری تیاری کرنے کے بعد عدالت میں دائر کرتے ہیں اور پہلے شاہدوں کو مہیا کر لیتے ہیں۔ اس کی ضرورت تو ایسے شخص کو ہوتی جس کا حق صرف ایک اسی صورت میں منحصر ہوتا ہے کہ ہبہ ثابت کیا جائے تو حق ہے ورنہ نہیں۔ سیدہ علیہا السلام کو اس طوالت کی ضرورت ہی کیا تھی کہ غیر حاضر لوگوں کو حاضر کریں اور ان کے انتظار میں اس قضیہ کو التواء میں ڈالیں۔ باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ جب آپ نے دیکھا کہ ہبہ نہیں مانا جا رہا ہے۔ تو آپ کو یہی کہنا تھا کہ چلو چھوڑو ہبہ کرنا نہیں مانتے ہو نہ سہی میں اپنے باپ کی

وارث تو ہوں یعنی اگر ان کی موجودگی میں تمہارے نزدیک فدک کی میں مالک نہ تھی تو اب وارث ہو کر ان کے بعد تو مالک ہوں۔

ہر شخص اپنی جگہ سوچے کہ اگر کسی کو اس کے باپ نے اپنی زندگی میں کوئی چیز دے دی ہو اور باپ کی وفات کے بعد کوئی غیر آدمی جس کا اس چیز میں کوئی حق نہ ہو اس سے یہ پوچھے کہ یہ چیز تم کو کیسے ملی تھی تو لا محالہ وہ جواب دے گا کہ میرے باپ نے دی تھی اس پر اگر اس سے کہا جائے کہ کس کے سامنے دی تھی تو اگر کوئی ایسا آدمی اس وقت وہاں موجود ہو گا تو اس کا نام لے دیا جائے گا۔ اگر اس آدمی کی شہادت کو ناکافی کہا جائے گا تو چیز والے کو کیا ضرورت ہے کہ وہ دوسروں کو بلاتا پھرے۔ وہ فوراً کہے گا کہ اس بحث سے فائدہ کیا؟ میں اپنے باپ کا وارث ہوں۔ دنیا میں ہر شخص ایسے موقع پر وہی صورت اختیار کرے گا جو سیدہ علیہا السلام نے کی۔ سیدہ علیہا السلام کے دعوائے وراثت پر جو جواب دیا گیا کہ انبیاء کے متروکہ کی میراث نہیں ہوتی بلکہ وہ صدقہ ہوتا ہے۔ سیدہ علیہا السلام نے فرمایا کہ یہ قول جو سراسر مخالف قرآن ہے، میرے باپ کا قول کیسے ہو سکتا ہے؟ چنانچہ سیدہ علیہا السلام نے ان آیات قرآنی کو پیش کیا جن میں عموماً اور خصوصاً انبیاء کی وراثت کا تذکرہ موجود ہے۔ لیکن سیدہ علیہا السلام کی بات کسی طرح نہ مانی گئی تو آپ نے فرمایا کہ میں نے اتمام حجت کے فرض کو پورا کر دیا۔

بالآخر سیدہ علیہا السلام نے صبر کرتے ہوئے اس قضیہ کو خدا کے سپرد کر دیا اور روز محشر اللہ کے فیصلہ پر چھوڑ دیا۔

اب اس کا فیصلہ روز محشر ہو گا اس روز فیصلہ کرنے والا اللہ ہو گا اور فیصلہ کرانے والے میرے ساتھ میرے باپ محمد ﷺ ہوں گے تم بھی اس دن کا انتظار کرو میں بھی اس دن کی منتظر ہوں۔ ہم اس سلسلہ میں علی مرتضیٰؑ کا قول بھی نہج البلاغہ سے پیش کر چکے ہیں کہ سرکار امامت نے عثمان بن حنیف سے فدک کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

نعم الحکم اللہ

یعنی اب اس کا فیصلہ یہاں نہیں بلکہ خدا کے یہاں ہو گا۔ صاف ظاہر ہے کہ فاطمہ اور علیؑ ان دونوں نے اتمام حجت کے بعد اپنا قضیہ اللہ کے فیصلہ پر چھوڑ دیا۔

جس امر کو سپرد خدا کر دیا جائے پھر اس حق کو اپنی طرف سے حاصل کرنے کی کوشش قطعاً نامناسب ہے

کسی امر کو سپرد خدا کرنے اور الٰہی فیصلہ پر چھوڑ دینے کے معنی ہی یہ ہیں کہ آج کے بعد ہم پھر کبھی کسی سے اپنے حق کے طالب نہ ہوں گے اور اس کے حاصل کرنے کی کبھی اپنی طرف سے کوشش نہ کریں گے۔ علیؑ و فاطمہ علیہا السلام دونوں نے اس امر کو خدا کے اور روز جزا کے فیصلہ پر چھوڑ دیا اور یہ طے کر لیا کہ اب ہم اس بارے میں اپنا حق حاصل

کرنے کے لیے کوئی کوشش نہ کریں گے اور کوئی قدم نہ اٹھائیں گے۔

دورِ خلافت علیؑ اور فدک:

نگاہ انصاف سے دیکھیں کہ سیدہ علیہا السلام اور ان کے ساتھ علی مرتضیٰؑ جب دونوں اس قضیہ کو سپرد خدا کر چکے تھے اور فیصلہ خدا پر چھوڑ چکے تھے تو اب سیدہ علیہا سلام کی دردناک وفات کے بعد ان کے شریک غم اور شریک فیصلہ یعنی ان کے شوہر اور فرزند اس فدک کو از خود حاصل کرنا اور باختیار خود لے لینا گوارا کر سکتے تھے؟ ہرگز نہیں۔ اس صورت میں اگر اپنی طاقت کی بنا پر فدک لے لیتے تو پھر علیؑ و فاطمہ علیہا السلام کے ان الفاظ کی کیا حقیقت رہ جاتی کہ ہمارے حق کے بارے میں بخل کیا گیا تو اب ہم نے اپنی سیر چشمی سے اسے خیر باد کہہ دیا اور اس قضیہ کو سپرد خدا کر دیا اور فیصلہ روز قیامت پر چھوڑ دیا اور اللہ کا فیصلہ ہر فیصلہ سے بہتر ہے۔ یہی اور صرف یہی وجہ ہے کہ فاطمہ زہرا علیہا السلام کے ورثاء نے کسی زمانہ میں بھی از خود فدک کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کس قدر افسوس ناک ہے یہ بات کہ یہ تو کہا جائے کہ اگر فدک حق فاطمہ علیہا السلام تھا تو علیؑ نے حسنین علیہم السلام کو کیوں نہ دیا جیسے علیؑ اور حسنین علیہم السلام الگ الگ دو فریق تھے معاذ اللہ یا گویا حسنین علیہم السلام فدک کے طالب تھے اور علیؑ نے ان کے طلب کرنے کے باوجود نہیں دیا، اور یہ نہ دیکھا جائے کہ اگر علیؑ کی نظر میں فدک حق فاطمہ علیہا السلام نہ ہوتا تو علی

مرتضیٰؑ فاطمہ زہرا علیہا السلام کے ہم نوا کیوں ہوتے؟ فاطمہ زہرا علیہا السلام کی تائید میں شہادت کیوں دیتے بلکہ علیؑ کے نقطہ نظر کے خلاف خود سیدہ علیہا السلام ہی دعوائے حق فدک کیوں کرتیں؟ اور جو فیصلہ حکومت نے کیا اس پر کیوں غضبناک ہوتیں اور مرتے دم تک کیوں غضبناک رہتیں؟ کیا کوئی باشعور انسان یہ سمجھ سکتا ہے کہ فاطمہ زہرا علیہا السلام کا اپنی حق رسی کے لیے حکام وقت کے پاس آنا اور اپنے حق کا دعویٰ کرنا اور تائید دعویٰ میں قرآنی اور انسانی دونوں قسم کی شہادتوں کا پیش کرنا اور فیصلہ حکومت پر ناراض ہونا یہ تمام تر اقدام علیؑ مرتضیٰ کی اجازت اور حمایت اور موافقت کے بغیر ہو سکتا تھا؟ ہرگز نہیں! پھر سیدہ علیہا السلام کا تادم مرگ ناراض رہنا اور وصیت کر جانا کہ وہ لوگ شریک جنازہ نہ ہوں اور علی مرتضیٰؑ کا اس وصیت پر پورے طور پر عمل کرنا، یہ سب کچھ کیا اس صورت میں ممکن تھا کہ فدک کے بارہ میں علی مرتضیٰؑ کا نظریہ سیدہ علیہا السلام کے نظریہ سے مختلف ہو؟ ہرگز نہیں۔ علی مرتضیٰؑ نے تو اپنے زمانہ خلافت میں بھی یہی فرمایا کہ دنیا میں ایک فدک ہمارے قبضہ میں تھا جس کے بارہ میں قوم نے بخل کیا تو ہم نے اپنی سیر چشمی سے اسے بھی خیر باد کہا اور فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ علی مرتضیٰؑ کے یہ کلمات میں پہلے لکھ چکی ہوں۔

فدک اپنے زمانہ خلافت میں علی مرتضیٰؑ نے کیوں نہ لیا؟

میں تفصیل سے لکھ چکی ہوں کہ علیؑ اور فاطمہ علیہا السلام دونوں

نے اتمام حجت کر کے کہہ دیا اور طے کر لیا کہ اب ہم نے اس مسئلہ کو سپرد خدا کر دیا اور روز آخرت اللہ کے فیصلہ پر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد یہ کیسے ممکن تھا کہ وفات سیدہ علیہا السلام کے بعد علی مرتضیٰؑ یا حسنین علیہم السلام یا اولاد فاطمہ زہرا علیہا السلام، سیدہ کے وارث ہو کر ان کے کئے ہوئے فیصلے سے منحرف ہوں اور بزور فدک لے کر سیدہ طاہرہ علیہا السلام سے بے وفائی کریں۔

فدک خلافت علی مرتضیٰؑ کے زمانہ میں کس کے پاس تھا؟

لوگ اپنی بے خبری کی بنا پر، محض اس اندازہ سے کہ جب خلافت علیؑ کو ملی تو ساتھ میں فدک بھی ضرور ان کے قبضہ میں آیا ہوگا، یہ سمجھ لیتے ہیں کہ فدک علی علیہ السلام کے پاس پہنچ گیا۔ حالانکہ یہ سراسر غلط ہے۔ علامہ شبلی کی الفاروق میں واضح لکھا ہے کہ فدک کو فاطمہ زہرا علیہا السلام سے چھین لئے جانے کے بعد، حضرت ابو بکر نے اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا اسی طرح اپنے زمانہ میں حضرت عمر نے بھی اپنے لیے مخصوص رکھا۔ اس کے بعد حضرت عثمان کا زمانہ خلاف آیا۔

حضرت عثمانؓ نے فدک کی جاگیر مستقل طور پر مروان کو عطا کر دی تھی:

تاریخ ابوالفداء سے تاریخ احمدی نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں ملاحظہ ہوں۔

مما نقم الناس علیه زده الحکم بن العاص طرید رسول الله و طرید ابی بکر و عمراً واعطائه مروان بن الحکم خمس غنائم افریقیة وهو خمس مائة الف دینار الی ان قال واقطع مروان بن الحکم فدك

یعنی جن باتوں نے لوگوں کو حضرت عثمان پر مشتعل کیا وہ یہ تھیں کہ انہوں نے حکم بن عاص کو مدینہ واپس بلا لیا جس کو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ سے نکال دیا تھا اور حضرت ابو بکر و عمر نے بھی اس کو نکالے ہی رکھا تھا۔ دوسرے یہ کہ حضرت عثمانؓ نے افریقہ کے مال غنیمت کا خمس (جو حق آل رسول ﷺ تھا) مروان بن حکم کو عطا کر دیا تھا جس کی مالیت پانچ لاکھ دینار تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی ایسی باتیں تھیں جن کے منجملہ ایک یہ بھی ہے کہ حضرت عثمان نے فدک کو بھی مستقل طور پر مروان کو بطور جاگیر دے دیا تھا۔ تاریخ روضۃ المناظر کی بھی عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

قال ابن شحنه فی روضته المناظر و فی سنة اربع فی ثلاثین اقطع مروان بن الحکم فدك

یعنی ابن شحنہ نے تاریخ روضۃ المناظر میں بیان کیا ہے کہ ۳۴ھ میں عثمان بن عفان نے مروان بن حکم کو فدک بطور جاگیر دے

دیا۔

غرض کہ فاطمہ زہرا علیہا السلام کی محرومی کے بعد سے ۳۴ھ تک یہ فدک ہر عہد کے خلیفہ کے لیے مخصوص رہا اور اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہرگز نہیں کہ خلفاء ثلاثہ نے اس معمولی سی جائیداد پر ایک شہنشاہی کے ہوتے ہوئے کسی لالچ کی وجہ سے قبضہ رکھا بلکہ اصل وجہ یہی ہے کہ حکومت جب کبھی کسی کو مخالف حکومت پا کر اس کی جائیداد ضبط کرتی ہے تو وہ منضبط جائیداد صرف حکومت کے زیر تصرف رہتی ہے اس میں عوام یا افراد کا کوئی حق نہیں ہوتا جب تک حکومت خود اپنی مرضی سے کسی کو عطا نہ کردے۔ فدک چونکہ سیدہ علیہا السلام سے ضبط کردہ جائیداد تھی اس لیے اس میں عامتہ المسلمین کا حق نہ تھا۔ لیکن جب ۳۴ھ میں حضرت عثمان نے اپنے داماد مروان بن حکم کو یہ جائیداد عطا کردی تو اس روز سے مروان کی ملکیت میں آ گئی۔ حضرت علیؑ کے زمانہ خلافت میں یہ جائیداد مروان ہی کے پاس رہی کیونکہ ورثاء فاطمہ جن میں بحیثیت شوہر خود علیؑ بھی تھے، حضرت علیؑ و فاطمہ علیہا السلام کے اس فیصلہ کے بعد کہ اس کا فیصلہ ہم نے اللہ پر چھوڑ دیا، اس جائیداد کو حاصل کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لا سکتے تھے۔

مروان کے بعد یہ جائیداد ان کی اولاد میں منتقل ہوتی رہی یہاں تک کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز تک پہنچی۔ اس خلیفہ نے اہلبیت علیہم

السلام کے بارہ میں جو سختیاں ہوتی چلی آ رہی تھیں، ان کو کسی حد تک دور کرنا چاہا۔ چنانچہ علی مرتضیٰؑ پر مساجد میں منبروں پر جو مخالفت عہد معاویہ سے ہو رہی تھی اس کو 99 ہجری میں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے حکماً بند کرادیا اور رقوم خمس بھی بنی ہاشم کے پاس بھیجیں دیکھئے تاریخ ابو الفدا اور کتاب الخراج (قاضی ابو یوسف)۔ اس خلیفہ نے اپنے عہد خلافت میں پہلی بار فدک بھی اولاد سیدہ علیہا السلام کو واپس کیا۔ چنانچہ کتاب اخبار الاوائل (ابو نیلام عسکری) سے نقل کیا گیا ہے کہ پہلا شخص جس نے فدک اولاد فاطمہ علیہا السلام کو واپس کیا وہ عمر بن عبدالعزیز تھے۔ لیکن عمر بن عبدالعزیز کے بعد فدک پھر اولاد فاطمہ علیہا السلام سے لے لیا گیا۔ یہاں تک کہ سفاح ابوالعباس کا زمانہ آیا تو انہوں نے پھر اولاد فاطمہ علیہا السلام کو فدک واپس کیا۔

سفاح کے بعد پھر اولاد فاطمہ علیہا السلام سے فدک لے لیا گیا۔ جب خلیفہ مہدی بن منصور کا زمانہ آیا تو انہوں نے پھر اولاد فاطمہؑ کو فدک واپس کر دیا۔ مہدی کے بعد پھر ورثا فاطمہؑ سے لے لیا گیا اس کے بعد جب مامون رشید کا زمانہ آیا تو انہوں نے علماء ملت کو جمع کیا اور فدک کے مسئلہ پر اپنے سامنے بحث کرائی اور بالآخر کار یہ طے ہوا کہ یہ حق سیدہ علیہا السلام تھا۔ مامون نے ایک جشن مسرت قائم کیا اور فدک اس جلسہ عام میں اولاد فاطمہ زہرا علیہا السلام کو واپس کیا گیا (اخبار الاوائل) مامون

الرشید کا اولاد فاطمہؑ کو فدک کا واپس کرنا فتوح البلدان (بلاذری) میں بھی مرقوم ہے۔ فتوح البلدان بلاذری کی عبارت یہ ہے۔

وقد كتب امير المومنين المامون بدفع فدك الى ولد فاطمة وقد كتب امير المومنين الى المبارك الطبرى مولى امير المومنين يا مره برد فدك على ورثة فاطمة بنت رسول الله بحدودها جميع حقوقها۔

یعنی امیر المومنین مامون رشید نے حکم دیا کہ فدک اولاد فاطمہ علیہا السلام کو دیا جائے اور اپنے غلام مبارک طبری کو لکھ بھیجا کہ فدک اپنی حدود اور تمام حقوق کے ساتھ ورثا فاطمہ بنت رسول ﷺ کو لوٹا دیا جائے۔ بلکہ تاریخ الخلفاء (علامہ سیوطی) نے یہ بھی لکھا ہے کہ

امر المامون بان ينادى برئت الذمة ممن ذكر معاويه بخير وان افضل بعد رسول الله على بن ابى طالب۔

یعنی مامون نے حکم دیا کہ یہ اعلان کر دیا جائے کہ جو شخص معاویہ کا ذکر بھلائی کے ساتھ کرے گا میں اِس کی جان و مال کا ذمہ دار نہیں ہوں اور یہ بھی اعلان کرایا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد علی ابن ابی طالبؑ خلق خدا میں سب سے افضل ہیں۔

چار خلفاء نے اپنے اپنے عہد میں فدک اولاد فاطمہؑ کو واپس کیا:

چار خلفاء ایسے گزرے ہیں جنہوں نے اپنے اپنے عہد میں

فدک کو حق سیدہ علیہا السلام تسلیم کر کے ان کی اولاد کو واپس کیا۔

عمر بن عبدالعزیز۔ ابوالعباس سفاح۔ مہدی بن منصور۔ مامون الرشید۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ خلفاء ثلاثہ کے ماننے والے تھے لیکن انہوں نے خلیفہ اوّل و ثانی و ثالث کے نظریات کو کالعدم اور حضرت شیخین کے فیصلہ کو غیر صحیح قرار دیا۔ ان چاروں خلفاء کو یہ بھی یقیناً علم تھا کہ حضرت علیؑ نے اپنے عہد خلافت میں فدک حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن اس سے انہوں نے یہ نتیجہ ہرگز اخذ نہیں کیا تو لامحالہ صریحی واقعات کی روشنی میں یہی سمجھا کہ علی مرتضیٰؑ کا فدک کی طرف سے صرف نظر رکھنا علیؑ کی غیرت، حمیت اور فاطمہ زہرا علیہا السلام سے وفا کی بنا پر تھا اور یہ کہ علی مرتضیٰؑ اپنے اور فاطمہ زہرا علیہا السلام کے قول (سپرد خدا کر دیا) پر مضبوطی کے ساتھ عمل پیرا تھے۔

اگر کوئی شخص از خود صاحب حق کا حق دے تو پھر صاحب حق کو اپنا حق لینے سے انکار کا کوئی حق نہیں ہے:

میں پہلے کہہ چکی ہوں کہ صاحب حق اگر اتمام حجت کے بعد کہہ دے کہ میں نے اس معاملہ کو سپرد خدا کیا اب اس کا فیصلہ اللہ کے یہاں ہو گا تو پھر اس کے لیے یہ روا نہیں کہ وہ کبھی بھی اس چیز کو حاصل کرنے کی کوئی سعی اپنی طرف سے کرے۔ وہ تو یہ کہے گا کہ مجھے میرے حق

سے محروم کیا گیا لیکن سپرد خدا کرنے کے بعد اس حق کو حاصل کرنے کے لیے کوئی قدم نہ اٹھائے گا۔ لیکن اس کے مقابلہ میں ایک صورت ہے وہ یہ کہ جس کے قبضہ میں یہ حق ہو اور وہ کسی وقت یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ واقعتاً یہ حق میرا نہیں ہے بلکہ حقدار کا حق ہے اگر حقدار کو حق واپس کرے تو اس صورت میں حقدار کو انکار کرنے کا حق نہیں ہے کیونکہ اب یہ مسئلہ موجودہ فریقین میں متنازعہ رہا ہی نہیں جس کا فیصلہ اللہ پر رکھا جائے۔ فیصلہ ہمیشہ نزاعی امور کا ہوا کرتا ہے اور سابق میں نزاعی ہونے کی ہی وجہ سے سپرد خدا کیا گیا تھا لیکن بعد کے خلفاء مذکورین نے جب حقدار کا حق تسلیم کر لیا تو اس وقت کے فریقین میں کوئی نزاع ہی نہ رہا۔ اب حق دار اپنا حق لینے سے انکار کرے تو کیا کہہ کر انکار کرے؟

البتہ جن اصل فریقین میں یہ مسئلہ نزاعی صورت میں قائم رہا یا فریقین کی جگہ آنے والوں میں سے جہاں جہاں بھی نزاعی رہا، ان کے درمیان الٰہی فیصلہ ہوگا۔ کیونکہ ہر نزاع کا آخری فیصلہ اسی روز ہوتا ہے۔

حکومت، مہاجرین اور انصار کے سامنے جو تقریر سیدہ علیہا السلام نے کی اس کا تذکرہ:

سیدہ علیہا السلام نے اس سلسلہ میں حکومت، مہاجرین اور انصار کے سامنے پہنچ کر جو تقریر فرمائی تھی اس کو خطبہ لمہ کے نام سے اکابر علماء اہل سنت نے بیان کیا ہے۔ لمہ رفقاء سفر کو کہتے ہیں۔ چونکہ اس وقت سیدہ

علیہا السلام تنہا نہ تھیں بلکہ گھر کی کنیزیں، خاندان کی مستورات، آپ علیہا السلام کے شوہر اور بچے بھی آپ کے ساتھ تھے اس لیے اس تقریر کو خطبہ لمہ سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس خطبہ کو ابو بکر جوہری نے اپنی کتاب سقیفہ میں روایت کیا ہے۔ اس کے علاوہ تذکرہ خواص الامتہ (علامہ سبط بن جوزی) اور تاریخ یافعی وغیرہ میں اس خطبہ کا تذکرہ اور اسی خطبہ کی مدح و ثناء لکھی ہے اور علامہ جار اللہ زمخشری نے اپنی کتاب فائق میں اس خطبہ کا اور اس کے بعض الفاظ کی لغوی حیثیت کا ذکر کیا ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے بھی لئالی موضونہ میں ابن قتیبہ کے حوالہ سے اس خطبہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ خطبہ ایک مفصل اور طولانی بیان ہے۔ اگرچہ اس وقت میرے سامنے ہے لیکن بخوف طوالت ہم اس کے لکھنے سے رک رہے ہیں۔

بی بیؑ کی تقریر کے آخری الفاظ:

تلقاك يوم حشرك فنعم الحكم الله والزعيم محمد و والموعد القيامة وعند الساعة ما ياوعدون و لكل بنا مستقر و سوف تعلمون من ياتيه عذاب يخزيه يحل عليه عذاب مقيم۔

یعنی یہ محرومہ میراث پدر (میں) حشر کے دن تیری شکایت کروں گی۔ اس روز اللہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہوگا اور محمدؐ مصطفی دعویدار ہوں گے۔ ہمارا اور تمہارا انصاف قیامت میں ہوگا ہر بات کا ایک مقام معین ہے تم عنقریب جان لو گے کہ رسوا کن اور

پائیدار عذاب کس پر ہوتا ہے۔ پھر فرماتی ہیں۔

وانا ابنۃ نذیر لکم بین یدی عذاب شدید فاعملو انا عاملون وانتظروا انا منتظرون۔

میں اس کی بیٹی ہوں جو تم لوگوں کو اللہ کے شدید عذاب سے ڈرانے کے لیے آئے تھے اب جو تمہیں کرنا ہو کرو اور جو ہمیں کرنا ہے ہم کریں تم بھی روز قیامت کا انتظار کرو ہم بھی اس دن کے منتظر ہیں۔ ان تمام کلمات سے بخوبی ظاہر ہو رہا ہے کہ سیدہ علیہا السلام نے اس قضیہ کو اللہ کے فیصلہ پر چھوڑ دیا اور سپرد خدا کیا۔ یہی الفاظ علی مرتضیٰؑ کے ہیں جن کو میں نہج البلاغہ سے نقل کر چکی ہوں یعنی

نعم الحکم اللہ

بہترین فیصلہ کرنے والا اللہ ہے۔ کیا اب کوئی منصف اور صاحب دل یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کے بعد علی مرتضیٰؑ کے لیے زیبا ہے کہ وہ اپنے زمانہ خلافت میں فدک پر قبضہ کرنے کا خیال بھی دل میں لائیں؟ ”لا واللہ“ ہرگز نہیں۔

فدک پر علی مرتضیٰؑ کا قبضہ نہ کرنا اس کی دلیل ہے کہ فدک صرف حق فاطمہ علیہا السلام تھا۔

فدک کے بارے میں صرف دو نظریے ہیں ایک نظریہ فاطمہ زہراؑ

کا ہے جس میں علی مرتضیٰؑ جن کے ہمنوا اور ہم آواز ہیں وہ یہ کہ فدک خالصتاً حق سیدہ علیہا السلام ہے۔ دوسرا نظریہ حکومت کا ہے وہ یہ کہ فدک شامل ریاست اسلامیہ ہے جو اسلام اور اسلامیان کے مفاد کے لیے ہے یعنی اس کی آمدنی سے دین اور دینداروں کے حقوق کو پورا کرنا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ علی مرتضیٰؑ کا اپنے زمانہ خلافت میں فدک کی طرف سے صرف نظر رکھنا اور فدک پر قبضہ نہ کرنا علی مرتضیٰؑ کے کس نظریہ کو ثابت کرتا ہے؟ یہ نکتہ جتنا لطیف ہے اتنا ہی فیصلہ کن ہے۔ یہ سوال پوری سنجیدگی سے حل کرنے کے لائق ہے کہ علی مرتضیٰؑ نے باوجود حکومت کے، جو فدک کو مروان کے پاس چھوڑے رکھا تو فدک کو اپنا سمجھ کر چھوڑے رکھا یا حق اسلام و مسلمین سمجھ کر چھوڑے رکھا۔ ظاہر ہے کہ انسان اگر اپنی ذاتی چیز کو اپنی سیر چشمی اور غیرت کی وجہ سے قابض کے پاس چھوڑے رکھے تو اس پر کسی طرف سے کوئی الزام نہیں آ سکتا کیونکہ جس کی چیز ہے اس کو اختیار ہے کہ وہ اپنی چیز کے لیے جدوجہد کرے یا خاموشی اختیار کرے۔

لیکن اگر وہ چیز اس کی اپنی نہیں ہے بلکہ وہ دین اور عامتہ المسلمین کا حق ہے تو خلیفہ رسول اللہ ﷺ اور والی ریاست پر واجب ہے کہ امکان کے ہوتے ہوئے ریاست اسلامیہ کے اس جز کو قبضہ غیر سے نکالے اور دینی مفاد کو محفوظ کرے۔ خلیفہ کا فرض اولین ہی یہ ہے کہ وہ ریاست اسلامیہ کو خورد برد نہ ہونے دے اور اس پر کسی کو ناجائز تصرف

نہ کرنے دے۔ لہٰذا روز روشن کی طرح عیاں ہو رہا ہے کہ علی مرتضیٰؑ کے نزدیک فدک ان کی اور ان کے بچوں کی ذاتی چیز تھی ورنہ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی دولت اسلامیہ کو قبضہ غیر میں نہیں چھوڑ سکتے تھے جب کہ وہ جائیداد تھی بھی آپؑ کے حدود سلطنت میں۔

ان تمام واقعات کے بعد اگر کوئی شخص چند شخصیات کی تعظیم نہیں کرتا، تو اس کا قصور نہیں ہے۔ یہ اُس کی ذاتی دُشمنی یا غم و غصہ تو ہے نہیں جو کوئی بھی شخص یہ جانے گا وہ ان خاص شخصیات کی تعظیم صرف انہیں واقعات کی وجہ سے نہیں کرے گا جو میں بیان کر چکی ہوں اس بات کی وجہ سے کوئی شیعہ کو کافر کہے تو غلط ہے سراسر غلط ہے۔ آج کے دور کے مشہور سنی عالم مولانا طارق جمیل سے کسی نے سوال کیا کہ شیعہ صحابہ کی عزت نہیں کرتے تو کیا وہ کافر ہیں؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ صحابہ کو نہ ماننے سے کوئی کافر نہیں ہوتا۔

اب باقی اختلافات کی طرف آتے ہیں۔
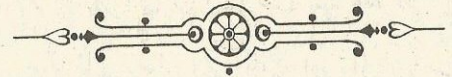
شیعہ نے کلمہ میں علیؑ ولی اللہ کا اضافہ کیا

شیعہ پر دوسرا بڑا اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے اپنا کلمہ تبدیل کرلیا اُس میں علی ولی اللہ کا اضافہ کیا ہے۔ کلمہ تبدیل کر لیا ہے اس لیے وہ کافر ہیں۔

لا الہ الا اللہ محمد الرسول علی ولی اللہ

علیؑ ولی اللہ کا اضافہ کرتے ہیں اس لیے مسلمان نہیں ہیں۔

معنی یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسولؐ ہیں اور شیعہ مزید کہتے ہیں کہ علی اللہ کے ولی ہیں۔ علی اللہ کے ولی ہیں اس بات کا اعتراف تو ہر مسلمان کرتا ہے۔ شیعہ نے اس جزو کو اپنے کلمہ کا حصہ بنا لیا تو کچھ غلط نہیں کیا۔ شیعہ کا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام لانے کے لیے کم سے کم "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا زبان سے ادا کرنا ضروری ہے اور جو شخص توحید اور رسالت کی گواہی دے وہ شرعاً مسلمان ہے اس کو وہی حق حاصل ہے جو دوسرے مسلمانوں کو حاصل ہے اور ان کے ساتھ وہی برتاؤ کیا جائے گا جو ایک مسلمان کے ساتھ ہوتا ہے۔

لیکن صرف اتنا کہنے سے کسی مسلمان کا ایمان کامل نہیں ہوتا اور

وہ اس وقت تک مومن نہیں کہلاسکتا جب تک وہ حضرت امیر المومنینؑ اور بقیہ ائمہ طاہرینؑ کی ولایت کی گواہی نہ دے اور ان پر ظلم کرنے والوں سے برائت کا اظہار نہ کرے اور ہم پیغمبر اکرمؐ کی نبوت و رسالت کے بعد یہ گواہی دیتے ہیں کہ حضرت علیؑ اور آپؑ کی اولاد کے دوسرے آئمہ معصومینؑ ہمارے امام ورہبر ہیں۔

شیعہ کے نزدیک اگر کوئی لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ پڑھتا ہے وہ مسلمان ہے۔
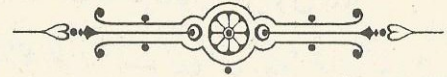
شیعہ کی نماز مختلف کیوں؟

عام طور پر سننے میں آتا ہے کہ شیعہ کا نماز پڑھنے کا طریقہ غلط ہے یہ بات اہلسنت بھی کہتے ہیں اور اہلحدیث بھی لیکن دیکھا جائے تو ملت اسلامیہ کے لیے یہ بات افسوس ناک ہی نہیں بلکہ حیران کن بھی ہے کہ آج تک مسلمان فرقوں کا اس بات پر ہی اتفاق نہیں ہو سکا کہ پیغمبر اکرمؐ کے نماز پڑھنے کا طریقہ کیا تھا؟ اور یہ اختلاف صرف شیعہ اور اہلسنت کے درمیان ہی نہیں بلکہ خود فقہائے اہل سنت بھی کسی ایک طریقہ پر متفق نہیں ہو سکے۔ انسان جوں جوں اس مسئلے پر غور کرتا جاتا ہے حیرت میں ڈوبتا چلا جاتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ یہ عمل اپنی زندگی میں ایک دو دفعہ ہی نہیں بجالائے اور نہ ہی آنحضرتؐ نے لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو کر نماز ادا کی اس سلسلے میں علمائے اہل سنت کے بیانات دیکھیں۔

1- حنفیہ کہتے ہیں کہ مرد تو اپنے ہاتھ ناف کے نیچے بائیں ہاتھ پر دایاں ہاتھ رکھیں اور عورتیں دونوں ہاتھ سینہ پر رکھیں۔[1]

2- حنابلہ کہتے ہیں کہ مرد اور عورت دونوں ہاتھ کی ہتھیلی بائیں ہاتھ

---

[1] (۱،۲،۳) الفقہ علی المذاھب الاربعہ ج۱،ص۳۹۹ تا ۴۰۰ مولف علامہ عبدالرحمن الجزیری شائع کردہ علماء اکیڈمی محکمہ اوقاف پنجاب

کی پشت پر ناف کے نیچے رکھیں۔

3- شافعی کہتے ہیں کہ مرد اور عورت دونوں کا دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو بائیں ہاتھ کی پشت پر سینے سے نیچے اور ناف سے اوپر (یعنی پیٹ پر) رکھنا سنت ہے۔

4- اہلسنت کے یہ تینوں امام تو مدینہ سے سینکڑوں میل دور پیدا ہوئے جبکہ چوتھے امام مالک بن انسؒ مدینۃ النبیؐ میں پیدا ہوئے۔ جب آنکھ کھولی اور ہوش سنبھالا تو مدینہ کے بڑے بوڑھوں کو جو کہ دراصل اکابر تابعین تھے ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا چنانچہ انہوں نے ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے کا فتویٰ دیا۔ علامہ غلام رسول سعیدی شرح مسلم میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔[1]

امام مالک کے نزدیک ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھنا۔ ان کے نزدیک ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنا فرض میں مکروہ اور نفل میں جائز ہے۔

4- اہلحدیث حضرات صحاح ستہ کی ہاتھ کھولنے والی احادیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں اور سینے پر ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے کو سنت قرار دیتے ہیں۔ ان کے مذہب میں عورتیں بھی سینہ پر

1 ملاحظہ ہو شرح مسلم ج۱، ص ۵۹۰ از علامہ غلام سعیدی مطبوعہ لاہور۔

ہاتھ رکھیں اور مرد بھی سینہ پر ہاتھ رکھیں۔[1]

حضرت عمرؓ کا طریقہ نماز:

عرب کے نامور اسکالر پروفیسر ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی نے ایک فقہی انسائیکلوپیڈیا مرتب کیا ہے جس کی آٹھ جلدیں اردو ترجمہ ہو چکی ہیں اور اس کی دوسری جلد ''فقہ حضرت عمرؓ'' کے نام سے کئی مرتبہ چھپ چکی ہے اس میں نماز کی کیفیت کے زیر عنوان پروفیسر ڈاکٹر محمد رواس لکھتے ہیں کہ نماز شروع کرتے وقت حضرت عمرؓ اپنے دونوں ہاتھ شانوں تک بلند کرتے پھر نیچے کر لیتے''

غور طلب بات:

بیان کی جا چکی پہلی روایت کے مطابق حضرت عمرؓ نماز شروع کرتے وقت دونوں ہاتھ شانوں تک بلند کرتے پھر نہ سینے پر باندھتے نہ زیر ناف بلکہ ڈاکٹر محمد رواس صاحب نے صاف لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ ہاتھ نیچے کر لیتے دوسری روایت جو ڈاکٹر صاحب نے مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے نقل کی ہے۔ اس میں بھی اگر معمولی غور کیا جائے تو یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہاتھ زیر ناف باندھے جائیں یا سینے پر۔ چادر میں سے نہ ہی ایک ہاتھ باہر نکالا جا سکتا ہے۔ نہ دونوں بلکہ یہ صرف اسی

1 ملاحظہ ہو صلوٰۃ الرسول ص ۱۹۰ مولفہ مولانا محمد صادق سیالکوٹی مطبوعہ لاہور۔

صورت میں ممکن ہے جب ہاتھ کھول کر نماز پڑھی جائے۔

پہلی صدی کی نامور علمی شخصیت امام حسن بصری کا طریقہ نماز:

امام حسن بصری پہلی صدی کی نامور علمی شخصیت جنہیں برادران اہلسنت سید التابعین بھی کہتے ہیں۔ جو حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں پیدا ہوئے اور حضرت عمرؓ ہی نے ان کی پیدائش پر شہد چٹایا اور ان کی علمی عظمت و جلالت اہل سنت کے ہاں کسی تعارف کی محتاج نہیں ان کا طریقہ نماز بھی بیان کر دیتی ہوں تا کہ واضح ہو جائے کہ صحابہ کرامؓ کے عہد شباب کے یہ بزرگ کس طرح نماز پڑھتے تھے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی اپنے فقہی انسائیکلو پیڈیا کی جلد نمبر 8 جو کہ فقہ امام حسن بصری کے نام سے چھپی ہے اس میں لکھتے ہیں کہ

نمازی قیام کے اندر اپنے دونوں ہاتھ چھوڑ رکھے گا اور اپنے سینے پر نہیں باندھے گا امام حسن بصریؒ اس طرح کیا کرتے تھے۔[1]

ام المومنین حضرت عائشہؓ کے گھر میں جماعت کروانے والے ان کے غلام کا طریقہ نماز:

مفتی اعظم سعودی عرب شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کو ایک

[1] فقہ امام حسن بصری ص ۵۳۸ طبع لاہور (اس کے لیے ڈاکٹر محمد رواس نے ابن ابی شبیہ ۱۱۱/۵۹ المغنی ۲/ ۷۲ ۱۱۱/۴ المجموع ۷۰/ ۳/۲ کے حوالہ جات درج کیے ہیں۔

شخص نے لکھا کہ مجھے منطقہ حائل میں نماز تراویح پڑھنے کا اتفاق ہوا امام صاحب قرآن مجید کو ہاتھ میں پکڑے دیکھ کر پڑھ رہے تھے رکوع میں جاتے وقت وہ قرآن رکھ دیتے دوسری رکعت میں پھر قرآن ہاتھوں میں پکڑ لیتے حتیٰ کہ وہ ساری نماز تراویح اس طرح دیکھ کر پڑھتے ہیں اس کے جواب میں یہ مفتی شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز لکھتے ہیں کہ:

قیام رمضان میں قرآن مجید کو دیکھ کر پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ اس طرح مقتدیوں کو سارا قرآن مجید سنایا جا سکے گا۔

کتاب و سنت کے شرعی دلائل سے یہ ثابت ہے کہ نماز میں قرآن مجید کی تلاوت کی جائے اور یہ حکم عام ہے اور دونوں صورتوں یعنی دیکھ کر پڑھنے اور زبانی پڑھنے کو شامل ہے اور ثابت نہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اپنے غلام ذکوان کو حکم دیا تھا کہ وہ قیام رمضان میں ان کی امامت کرائیں اور ذکوان نماز میں قرآن مجید دیکھ کر پڑھا کرتے تھے امام بخاری نے اس حدیث کو صحیح میں صحت کے وثوق کے ساتھ ذکر فرمایا ہے[1]

علمائے اہلسنت کے نماز پڑھنے کے طریقے کے بارے میں بیانات:

اتنی بات تو ہر شخص کی عقل میں آ سکتی ہے نبیؐ ایک ہی طریقہ سے نماز ادا فرماتے تھے اور وہی طریقہ آپ نے اپنے صحابہ کو بھی تعلیم

[1] مقالات و فتاوی شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز ص ۳۳۸ شائع کردہ ۵۰۔ مال روڈ لاہور۔

فرمایا تھا کیونکہ بخاری شریف کی مشہور حدیث ہے جس میں آنحضرتؐ فرماتے ہیں۔

صلوا کما رایتمونی اصلی۔

تم اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو۔

اب بات غور طلب کہ برادران اہلسنت کے پانچ طریقہ ہائے نماز میں سے کونسا طریقہ صحیح ان میں سے کس طریقہ سے آنحضرتؐ نماز ادا فرماتے تھے۔ کیا آپؐ سینے پر ہاتھ باندھتے تھے یا پیٹ پر ہاتھ رکھتے تھے جیسے شافعی حضرات کہتے ہیں ۔ زیر ناف رکھتے تھے یا ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے جیسے مالکی سنی کہتے ہیں۔ جب اہل سنت کوئی حتمی رائے قائم نہ کر سکے تو بعض علمائے اہلسنت نے ایک عجیب وغریب بیان دے دیا جیسے امام نووی نے اپنی شرح مسلم میں لکھا ہے وہ لکھتے ہیں۔

امام احمدؒ اوزاعی اور ابن منذر کا بیان ہے کہ نمازی کو اختیار ہے جیسے چاہے کرے۔ امام مالکؒ کا بیان ہے کہ نمازی کو اختیار ہے چاہے تو سینے پر ہاتھ باندھے اور چاہے نہ باندھے اور یہی قول مالکیہ حضرات کے نزدیک رواج یافتہ ہے نیز انہوں نے کہا کہ نفل میں ہاتھ باندھے اور فرض نمازوں میں چھوڑ دے اور لیث بن سعد کا بھی قول یہی ہے۔[1]

---

۱ شرح مسلم مع مختصر شرح نووی ج'۲' ص ۲۸ ترجمہ مولانا وحید الزمان شائع کردہ نعمانی کتب خانہ لاہور

آئمہ اہلبیتؑ کا طریقہ نماز:

ائمہ اہلبیتؑ کے طریقہ نماز کے بارے میں یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ یہ بزرگ ہستیاں ہاتھ چھوڑ کر نماز ادا فرماتی تھیں جیسا کہ شیعہ کتب احادیث میں اپنے صحابی جناب حماد کو نماز کی تعلیم دیتے ہوئے اور نماز کا طریقہ بتاتے ہوئے امام جعفر صادقؑ نے خود ایسا کر کے دکھایا۔ شیخ محمد بن یعقوب کلینی اور شیخ صدوقؒ لکھتے ہیں کہ

حضرت روبقبلہ کھڑے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ پوری طرح چھوڑ کر دونوں رانوں پر رکھے اور اپنی انگلیاں ملالیں اور اپنے دونوں پاؤں قریب قریب رکھے۔[1]

اہلسنت محقق جناب ڈاکٹر حمید اللہ پی ایچ ڈی نے یہ لکھ دیا ہے کہ

''شیعہ اور سنی نمازوں میں جو فرق ہے میری دانست میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ مالکی مذہب کے لوگ جو سنی ہیں وہ بھی ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں جس طرح شیعہ پڑھتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ رسولؐ نے کبھی اس طرح پڑھا اور کبھی دوسری طرح پڑھا[2]۔

---

۱ ''الشافی'' ترجمہ فروع کافی ج ۲، ص ۶۵ مطبوعہ کراچی یحضرہ الفقیہ ج ۱، ص ۱۶۶ مطبوعہ کراچی

۲ خطبات بہاولپور از ڈاکٹر حمید اللہ پی ایچ ڈی ص ۳۴ شائع کردہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

ہاتھ کھول کر بھی نماز پڑھ سکتے ہیں، باندھ کر بھی، سینے پر بھی باندھ سکتے ہیں۔ بالائے ناف بھی، آمین پکار کر بھی کہہ سکتے ہیں اور آہستہ بھی۔ غرض کہ بعض امور کے سوا کسی خاص طریقہ کی پابندی ضروری نہیں۔ چنانچہ مختلف اماموں نے مختلف صورتیں اختیار کیں۔[1]

کاش کہ علمائے اہلسنت تھوڑی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے عوام الناس کو بھی اس مسئلے سے آگاہ کریں تاکہ شیعہ سنی عوام میں جو دوری موجود ہے، کچھ کم ہو سکے۔

جن لوگوں کو لیبیا جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ وہاں تمام اہلسنت مالکی ہیں اور ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر بہت سارے ممالک بشمول عرب ممالک میں جو اہلسنت امام مالک کے پیروکار ہیں، وہ ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے ہیں بلکہ ایک امام کے پیچھے ہاتھ کھولنے اور باندھنے والے نماز ادا کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایسی وسیع القلبی عطا فرمائے۔

نماز پڑھنے کے طریقے میں تبدیلی کب اور کیسے ہوئی؟

ہر تحقیق پسند ذہن اور تاریخ کا ہر انصاف پسند شخص یہ جاننا چاہے

1 ملاحظہ ہو علم الکلام اور کلام ص ۳۱۱ شائع کردہ نفیس اکیڈمی کراچی

گا کہ نماز جو امت کی وحدت کا سب سے بڑا ذریعہ تھی، اس کے پانچ چھ طریقے کیسے رائج ہو گئے اور امت کی وحدت پر یہ کاری ضرب کب لگی؟ اگر نماز کے قیام رکوع سجود اور تشہد وغیرہ کے اذکار پر غور کیا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ شیعوں اور اہل سنت کے نزدیک ان میں سے بعض بالکل ایک جیسے ہیں اور بعض میں بہت معمولی سا فرق ہے اور ہمارے محترم علمائے اکرام اگر تھوڑی سی برداشت کا مظاہرہ کریں تو امت کی وحدت قائم ہو سکتی ہے۔ خیر جہاں تک ہمارے سوال کے پہلے حصے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں جواباً عرض ہے کہ نماز کے طریقے میں تبدیلی یکدم نہیں ہوئی بلکہ آہستہ آہستہ ہوتی رہی مثلاً بخاری و مسلم کی روایت ہے مطرف بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ہم نے بصرہ میں حضرت علیؑ کے پیچھے نماز پڑھی۔ جب ہم نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت عمرانؓ بن حصینؓ جو کہ صحابی رسولؐ تھے، انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا:

انہوں نے (حضرت علیؑ نے) ایسی نماز پڑھائی جیسی آنحضرتؐ پڑھایا کرتے تھے یا یوں کہا انہوں نے مجھ کو آنحضرتؐ کی نماز یاد دلائی[1]

بخاری و مسلم کی اس حدیث میں تھوڑا سا غور کیا جائے تو مزید وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی کہ طریقہ نماز میں تبدیلی کی ابتداء اس عہد

1 تیسر الباری شرح بخاری ج۱، ص ۵۴۴ صحیح مسلم مع مختصر شرح نووی ج۲، ص ۲۰ ترجمہ وحید الزمان

میں شروع ہو چکی تھی تبھی تو حضرت عمرانؓ بن حصینؓ کو کہنا پڑا کہ حضرت علیؑ نے ہم کو ویسی نماز پڑھائی جیسی نبی اکرمؐ پڑھایا کرتے تھے۔ اب رہا میرے سوال کا دوسرا حصہ کہ نماز کے طریقہ میں تبدیلی کیوں ہوئی؟ اس سلسلے میں میرا جواب یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد اگر امت ایک مرکز یعنی آل رسولؐ سے وابستہ رہتی تو نماز جیسے روز مرہ کے مسئلہ میں اختلاف رونما نہ ہوتا۔ جب مرکز ایک نہ رہا تو اختلاف پیدا ہونا فطری امر تھا۔

رکوع وسجود میں پیغمبر اکرمؐ کیا ذکر فرماتے تھے؟

ائمہ اہلبیتؑ سے رکوع میں تین مرتبہ سبحان ربی العظیم و بحمدہ اور سجدہ میں تین مرتبہ سبحان ربی الاعلیٰ و بحمدہ پڑھنا منقول ہے۔[1]

علامہ وحید الزمان مرحوم نے بخاری کے حاشیے پر آنحضرتؐ کے تین قسم کے ذکر نقل کیے ہیں اور پھر لکھا ہے:

اہلبیت رضوان اللہ علیہم سے منقول ہے کہ رکوع میں سبحان ربی العظیم و بحمدہ کہتے اور سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ و بحمدہ۔[2]

سنن ابی داؤد کی ایک حدیث میں آنحضرتؐ کا طریقہ بھی اس

---

1 من لایحضرہ الفقیہ ج۱،ص۱۶۷ مطبوعہ کراچی الشافی فروع کافی ج۲،ص۹۱ مطبوعہ کراچی۔

2 تیسرا لباری شرح بخاری ج۱،ص۵۲۳ مطبوعہ کراچی

طرح لکھا ہوا ہے۔ حدیث کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

کان رسول اللہ ﷺ اذا رکع قال سبحان ربی العظیم و بحمدہ ثلاثا واذا سجد قال سبحان ربی الاعلی و بحمدہ ثلاثا قال ابی داؤد و ھذہ الزیادۃ نخاف ان لا تکون محفوظۃ

رسول پاکؐ جب رکوع کرتے تو تین دفعہ سبحان ربی العظیم وبحمدہ کہتے ہیں اور جب سجدہ کرتے تو تین مرتبہ سبحان ربی الاعلیٰ وبحمدہ کہتے۔[1]

یہ حدیث نقل کرنے کے بعد ابی داؤد لکھتے ہیں کہ ہم کو خوف ہے کہ و بحمدہ کی زیارت محفوظ نہ ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ جب خود مولانا وحید الزمان نے تسلیم کیا کہ اہلبیت اطہارؑ سے بھی رکوع وسجود میں یہی ذکر منقول ہے تو پھر اہلبیتؑ سے زیادہ سنت پیغمبرؐ سے کون واقف ہو سکتا ہے۔

دونوں سجدوں کے درمیان دعا پڑھنا:

نماز چونکہ خدا کی بندگی اور اس کے سامنے عاجزی کرنے کا نام ہے، اس لیے شیعہ دونوں سجدوں کے درمیان بھی "استغفر اللہ ربی و اتوب

---

1 ملاحظہ ہو سنن ابی داؤد ج۱، ص۳۶۸ ترجمہ وحید الزمان خان شائع کردہ نعمانی کتب خانہ اردو بازار لاہور۔

الیہ'' کہہ کر خدا سے مغفرت طلب کرتے ہیں۔ یہ ذکر بھی اہل بیت اطہارؑ سے منقول ہے۔

جمع بین الصلوٰتین یعنی دونمازوں کو اکٹھے پڑھنا:

شیعہ ظہر عصر اور مغرب عشاء کی نمازیں ملا کر پڑھ لیتے ہیں۔ ہم یہ کام بھی اپنی طرف سے نہیں بلکہ سنت پیغمبرؐ کی روشنی میں کرتے ہیں۔

بخاری شریف میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ

صلیت مع رسول اللہ ﷺ ثمانیا جمیعا وسبعا جمیعا قلت یا أبا الشقاء أظنه أُخر الظهر و عجل العصر عجل العشاء وأخر المغرب قال وأنا أظنه

میں نے آنحضرت کیساتھ (ظہر وعصر) آٹھ رکعتیں اور (مغرب و عشاء) سات رکعتیں ملا کر پڑھیں (بیچ میں سنت وغیرہ کچھ نہیں) عمرو نے کہا میں نے ابوالشفاء سے کہا میں سمجھتا ہوں آپؐ نے ظہر میں دیر کی اور عصر میں جلدی اور عشاء میں جلدی کی اور مغرب میں دیر کی ابوالشفاء نے کہا میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔[1]

اس حدیث کی شرح میں مولانا وحید الزمان خان لکھتے ہیں:

---

1 ملاحظہ ہو تیسرا لباری شرح بخاری ج۲،ص۱۸۷ ترجمہ و شرح مولانا وحید الزمان خان کتاب التہجد شائع کردہ تاج کمپنی کراچی۔

یہ حدیث صاف ہے کہ دو نمازوں کا جمع کرنا جائز ہے۔ دوسری روایت میں ہے یہ واقعہ مدینہ کا ہے نہ وہاں کوئی خوف تھا نہ بارش تھی اوپر گزر چکا ہے کہ اہلحدیث کے نزدیک یہ جائز ہے۔

دوسری حدیث انہی حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

عن ابن عباسؓ النبیؐ صلی بالمدینة سبعا و ثمانیاً اظهر والعصر والمغرب والعشاء أيوب لعله فی ليلة مطيرة قال عسى

عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے مدینہ میں رہ کر (یعنی سفر نہ تھا) سات رکعتیں مغرب اور عشاء کی اور آٹھ رکعتیں ظہر اور عصر کی (ملا کر) پڑھیں۔ ایوب سختیانی نے جابر بن زید سے کہا شاید بارش کی رات میں ایسا کیا ہوگا انہوں نے کہا شاید۔[1]

اس آخری فقرہ ''یعنی جابر بن زید نے کہا شاید بارش کی رات میں ایسا کیا ہوگا'' کی شرح میں مولانا وحید الزمان لکھتے ہیں:

---

1 ملاحظہ ہو تیسرالباری شرح بخاری ج۱،ص۳۷۰ کتاب مواقیت الصلوۃ شائع کردہ تاج کمپنی کراچی

یہ جابر کی ایک احتمالی بات ہے مسلم کی روایت سے اس کی غلطی ثابت ہوتی ہے اس میں یہ ہے کہ نہ مینہ تھا نہ کوئی اور خوف۔

پھر آگے مولانا وحید الزمان لکھتے ہیں:

ابن عباس نے دوسری روایت میں کہا کہ آپؐ نے یہ جمع اس لیے کیا تاکہ آپؐ کی امت کو تکلیف نہ ہو۔

اب صحیح مسلم کی روایت ملاحظہ ہو:

عن ابن عباس ؓ قال جمع رسول اللہ ﷺ بین الظھر والعصر والمغرب و العشاء باالمدینۃ فی غیر خوف ولا مطر و فی حدیث و کیع قال قلت لابن عباس ؓ لم فعل ذالك کی لا یمرح امنہ و فی حدیث ابی معاویۃ قیل لابن عباس ؓ ما ارادانی ذالك قال اراد ان لا یحرج امتہ۔

ابن عباسؓ نے کہا کہ رسول اللہؐ نے ظہر اور عصر کو اور مغرب اور عشاء کو مدینہ میں بغیر خوف اور مینہ کے جمع کیا وکیع کی روایت میں ہے کہ میں نے ابن عباسؓ سے کہا کہ آپؐ نے یہ کیوں کیا؟ انہوں نے کہا تاکہ آپ کی امت کو تکلیف نہ ہو اور ابی معاویہ کی روایت میں ہے کہ ابن عباس سے کسی نے یہ کہا کہ کس ارادے

سے آپ نے یہ کیا؟ انہوں نے کہا تاکہ آپ کی امت کو تکلیف نہ ہو۔[1]

سنن ابی داؤد میں اس باب کے شروع میں جو وضاحت موجود ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

جمع کی دو صورتیں ہیں ایک جمع تقدیم اور دوسری جمع تاخیر ہے جمع تقدیم یہ ہے کہ ظہر کے وقت عصر اور مغرب کے وقت عشاء پڑھ لے اور جمع تاخیر یہ ہے کہ عصر کے وقت میں ظہر اور عشاء کے وقت میں مغرب پڑھے۔ دونوں طرح کی جمع آنخضرتؐ سے ثابت ہیں۔[2]

مولانا وحید الزمان آخر میں یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

جن لوگوں کے نزدیک جمع درست نہیں ہے ان کے دلائل ضعیف ہیں اور جمع جائز رکھنے والے کے دلائل قوی ہیں۔[3]

---

1 ملاحظہ ہو صحیح مسلم مع مختصر شرح نووی ج ۲، ص ۲۲۴ تا ۲۲۵

2 ملاحظہ ہو سنن ابی داؤد ترجمہ مولانا وحید الزمان ج ۱، ص ۴۹۰ مطبوعہ لاہور ترجمہ مولانا وحید الزمان شائع کردہ نعمانی کتب خانہ اردو بازار لاہور۔ یہی روایت جامع ترمذی ج ۱، ص ۱۰۹ ترجمہ بدیع الزمان شائع کردہ نعمانی کتب خانہ لاہور۔ سنن ابی داؤد ج ۱، ص ۴۹۰ باب جمع بین الصلوٰتین ترجمہ مولانا وحید الزمان شائع کردہ کتب خانہ پر بھی موجود ہے۔

3 ملاحظہ ہو سنن ابی داؤد ترجمہ مولانا وحید الزمان ج ۱، ص ۴۹۰ مطبوعہ لاہور

ایک دفعہ اذان دیکر دونمازیں پڑھنا:

جب یہ بات احادیث سے اچھی طرح ثابت ہوگئی کہ دونمازوں کو اکٹھا پڑھنا شیعوں کی ذاتی اختراع نہیں بلکہ سنت رسول اکرمؐ ہے اور نبی کریمؐ نے یہ کام اس لیے کیا کہ تاکہ میری امت کو تکلیف نہ ہولیکن یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ اگر نمازوں کو الگ الگ بھی پڑھ لیا جائے تو بھی درست ہوگا چونکہ پیغمبر اکرمؐ کے حکم میں وسعت اور گنجائش موجود ہے اس لیے ہم اس سہولت کا فائدہ اٹھالیتے ہیں اب بعض اہلسنت دوستوں کا یہ اعتراض باقی رہ جاتا ہے شیعہ تین اذانیں کیوں دیتے ہیں؟ جواباً عرض ہے کہ چونکہ سنت پیغمبرؐ میں موجود سہولت کی بنا پر ہمارے ہاں یہ بات رائج ہے کہ لوگ ایک دفعہ اکٹھے ہو گئے پہلے ظہر یا مغرب کی نماز پڑھ لی اس کے بعد اکثر جگہ پر بغیر سپیکر دوسری اذان مسجد کے اندر ہی اندر دے دی جاتی ہے اس کے بعد عصر یا عشاء کی نماز پڑھ لی جاتی ہے۔ یہی طریقہ خود علمائے اہل سنت نے بھی لکھا ہے علامہ عبدالرحمن الجزیری لکھتے ہیں:

> نماز جمع کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے حسب معمول بلند آواز سے مغرب کی اذان دی جائے اور اذان کے بعد اتنی تاخیر کی جائے جتنی دیر میں تین رکعت نماز پڑھی جا سکے۔ اس کے بعد مغرب کی نماز پڑھی جائے پھر مسجد کے اندر ہی عشاء کے لیے اذان دینا

> مستحب ہے یہ اذان مینارے پر نہ ہونی چاہیے تاکہ یہ خیال نہ کیا جائے کہ حسب معمول عشاء کا وقت ہے اس لیے اذان بھی ہلکی آواز سے دی جائے اور پھر عشاء کی نماز پڑھی جائے۔[1]

اگر پڑھے لکھے اہلسنت برادران مندرجہ بالا الفاظ پر غور فرمائیں توشیعوں پر اعتراض خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔

سجدہ گاہ پر سجدہ کرنا:

شیعہ جب نماز پڑھتے ہیں تو سجدہ کی جگہ پر عام طور پر مٹی کی سجدہ گاہ رکھتے ہیں کیونکہ یہ پیغمبر اکرمؐ کی سنت سے ثابت ہے اور برادران اہلسنت کی کتب احادیث میں بڑی صراحت سے یہ بات آئی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ جب نماز پڑھتے تو سجدہ گاہ پر سجدہ کرتے تھے۔ احادیث میں لفظ خمرہ آیا ہے۔ جس کا ترجمہ علمائے اہلسنت نے سجدہ گاہ کیا ہے۔ بخاری شریف میں ام المؤمنین حضرت میمونہؓ سے روایت ہے کہ

قالت وکان یصلی علی الخمرۃ

ام المؤمنین فرماتی ہیں کہ آنحضرتؐ سجدہ گاہ پر سجدہ کیا کرتے تھے۔[2]

---

1 الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج۱،ص۷۸۱ ترجمہ منظور احمد عباسی شائع کردہ علماء اکیڈمی محکمہ اوقاف پنجاب۔

2 بخاری شریف ج۱،ص۱۱۸ ترجمہ علامہ عبدالحکیم اختر شاہجہانپوری مطبوعہ لاہور

مولانا وحید الزمان اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

تمام فقہاء نے اس پر اتفاق کیا کہ سجدہ گاہ پر نماز درست ہے مگر عمر بن عبدالعزیز سے منقول ہے کہ ان کے لیے مٹی لائی جاتی وہ اس پر سجدہ کرتے اور ابن ابی شیبہ نے عروہ سے بیان کیا کہ وہ سوائے مٹی کے کسی اور چیز پر سجدہ کرنا مکروہ جانتے تھے۔[1]

بلکہ امام بخاری نے بخاری شریف [2] اور امام ابوداؤد نے سنن ابی داؤد [3] میں ایک الگ باب باندھا ہے جس کا عنوان ہے الصلوٰۃ علی الخمرہ یعنی سجدہ گاہ پر نماز پڑھنا۔

پیغمبر اکرمؐ کا سجدہ گاہ پر نماز پڑھنا ایسی مشہور بات ہے کہ جسے اکثر بڑے بڑے محدثین نے اپنی کُتب احادیث میں نقل کیا ہے۔ ام المؤمنین حضرت میمونہؓ کی روایت جو پیچھے بخاری کے حوالے سے نقل ہوئی ہے۔ وہی روایت مسلم شریف [4] میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ ترمذی شریف [5] میں بھی حضرت ابن عباس سے آنحضرتؐ کی سجدہ گاہ پر نماز

1 تیسرالباری شرح بخاری ج۱ص۲۷۵ شائع کردہ تاج کمپنی کراچی
2 تیسرالباری شرح بخاری ج۱ص۲۷۶
3 سنن ابی داؤد ج۱ص۲۹۱ ترجمہ مولانا حید الزمان شائع کردہ
4 مسلم مع مختصر شرح نووی ج۲،۱۹۵ ترجمہ مولانا وحید الزمان شائع کردہ نعمانی کتب خانہ لاہور۔
5 ترمذی شریف ج۱،ص۱۵۶ ترجمہ بدیع الزمان مطبوعہ لاہور

پڑھنے کی روایت موجود ہے۔ انہی حقائق کی بناء پر اہل سنت کے مدینہ میں پیدا ہونے والے امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ

زمین کے علاوہ کسی اور چیز پر یا نباتات پر نماز پڑھنا مکروہ ہے۔(ملاحظہ ہو اردو ترجمہ المحلیٰ جلد نمبر ۳ ص ۱۱۵ از امام ان حزم اندلسی مطبوعہ لاہور)

خمرہ کیا ہے؟

جن احادیث میں آنحضرتؐ کا سجدہ گاہ پر نماز پڑھنا نقل ہوا ہے ان کے الفاظ عام طور پر یہ ہیں: ”وکان یصلی علی الخمرۃ“ یعنی آنحضرتؐ خمرہ پر سجدہ کرتے تھے۔ مولانا وحید الزمان خان حیدر آبادی نے لغات الحدیث نامی کتاب لکھی جو کئی جلدوں میں ہے اس میں وہ لکھتے ہیں:

خمرہ وہ چھوٹا ٹکڑہ بوریے کا یا کھجور کے پتوں کا بنا ہوا جس پر ہر سجدے میں آدمی کا سر فقط آ سکتا ہے۔ پھر تھوڑا آگے لکھتے ہیں:

ابن الاثیر نے شرح جامع الاصول میں کہا کہ ”خمرہ سجدہ گاہ ہے“ جس پر ہمارے زمانے میں شیعہ سجدہ کرتے تھے۔[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

1 لغات الحدیث ج۱(ص ۱۳۳، ۱۳۶، ۱۱۳) کتاب ”خ“ مطبوعہ کراچی

اگرچہ ہمارے مذہب میں کپڑے پر جائز ہے پر بہتر یہ ہے کہ مٹی یا بوریے پر سجدہ کرے۔[1]

مولانا وحید الزمان خان کا اعتراف:

سجدہ گاہ پر سجدہ کرنے کی بحث سمیٹتے ہوئے مولانا وحید الزمان لکھتے ہیں:

میں کہتا ہوں اس حدیث سے سجدہ گاہ رکھنا مسنون ٹھہرا اور جن لوگوں نے اس سے منع کیا اور رافضیوں کا طریقہ قرار دیا ان کا قول صحیح نہیں ہے۔ میں تو کبھی کبھی اتباع سنت کے لیے پنکھ جو بورئے سے بنا ہوتا ہے بجائے سجدہ گاہ کے رکھ کر اس پر سجدہ کرتا ہوں اور جاہلوں کے طعن و تشنیع کی کچھ پرواہ نہیں کرتا ہمیں سنت رسولؐ اللہ سے غرض ہے۔ کوئی رافضی کہے یا کوئی خارج پڑا بکا کرے۔[2]

دوسری جگہ پر اہلحدیث عالم لکھتے ہیں کہ

جس مسجد میں کپڑے کا فرش ہوتا ہے تو میں اکثر اس پر اپنا بوریا بچھا کر نماز پڑھتا ہوں بعض اہل سنت والجماعت حضرات خواہ مخواہ مجھ پر لعن طعن کرتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ ہم ایسی نماز کیوں نہ پڑھیں جو سب کے نزدیک جائز ہو اسی میں زیادہ احتیاط ہے۔ آنحضرتؐ سے کپڑے پر

[1] لغات الحدیث ج۱ (ص ۱۳۳، ۱۳۶، ۱۱۳) کتاب ''خ'' مطبوعہ کراچی

[2] لغات الحدیث ج۱ (ص ۳، ۱۲) کتاب ''خ'' مطبوعہ کراچی

بھی نماز پڑھنا منقول ہے۔ مگر فرائض کا کپڑے پر پڑھنا جائز نہیں ہے گو صحابہؓ سے منقول ہے آنحضرتؐ کی عادت یہ تھی کہ یا تو مٹی پر نماز پڑھتے یا بوریے پر۔
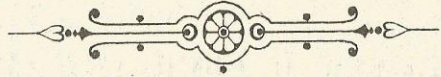
وضو میں پاؤں کا مسح کرنے یا دھونے کا اختلاف

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْ سِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَی الْكَعْبَیْنِ ؕ (سورہ مائدہ۔ آیت 4)

اے ایماندارو! جب تم نماز کے لیے آمادہ ہو تو اپنے منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھولیا کرو اور اپنے سروں کا اور ٹخنوں تک اپنے پاؤں کا مسح کرلیا کرو۔[1]

شیعہ سنی علماء کا اتفاق ہے کہ وضو میں چار چیزیں فرض ہیں۔ باقی امور دھونا اور منہ اور ناک میں تین تین بار پانی ڈالنا سنت ہیں جو امور فرض ہیں ان کا ذکر مذکورہ بالا آیت میں موجود ہے۔ اس آیت پر اگر سرسری نگاہ ڈالی جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس آیت کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ایمان والوں سے خطاب ہے کہ جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو۔ دوسرے حصے میں جن اعضاء کو دھونا ہے ان کا ذکر ہے

1 ملاحظہ ہو سورہ مائدہ آیت نمبر ۶ ترجمہ شیعہ مفسر حافظ سید فرمان علی طبع لاہور

اور تیسرے حصے میں جن اعضاء پر مسح کرنا ہے ان کا ذکر ہے۔ اس آیت کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

ایمان والوں کو خطاب کرنے کے بعد دھونے والے اعضاء یعنی کہنیوں تک ہاتھ اور منہ کا ذکر ”فاغسلوا“ کے بعد آیا ہے اور مسح کرنے والے اعضاء یعنی سر اور پاؤں کا ذکر ”وامسحوا“ کے بعد آیا ہے۔ یہ آیت بڑی واضح ہے جسے سمجھنا بڑا آسان ہے۔

وضو میں شیعہ سنی اختلاف کیا ہے؟

واضح رہے کہ وضو میں شیعہ سنی اختلاف جو کچھ بھی ہے وہ اس آیت کے آخری حصہ میں ہے۔ شیعہ موقف تو واضح اور دوٹوک ہے کہ آیت میں جن دو اعضاء کے دھونے کا حکم ہے وضو میں انہیں دھونا ہی ہے اور جن دو اعضاء کے مسح کا حکم ہے یعنی سر اور پاؤں ان کا مسح کیا جائے وضو والی آیت کا شیعہ نقطہ نگاہ سے ترجمہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔

اب علمائے اہلسنت کے تراجم ملاحظہ فرمائیں۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسن مرحوم اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

اے ایمان والو! جب تم اٹھو نماز کو تو دھولو اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک اور مل لو اپنے سر کو اور پاؤں ٹخنوں تک۔[1]

ایک دوسرے اہلسنت مفسر مولانا اشرف علی تھانوی اس آیت کا

1 ملاحظہ ہو ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن طبع لاہور

ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھنے لگو تو اپنے چہروں کو دھوؤ اور اپنے ہاتھوں کو بھی کہنیوں سمیت اور اپنے سروں پر ہاتھ پھیرو اور اپنے پاؤں کو بھی ٹخنوں تک۔[1]

ہمارے پیش نظر مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم کا جو ترجمہ ہے 1954ء کا مطبوعہ ہے اور شیخ برکت اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور کا شائع کردہ ہے۔ لیکن مولانا کے اس ترجمہ میں تحریف کردی گئی ہے اور موجودہ ترجمہ اس طرح ہے کہ

اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھنے لگو تو اپنے چہروں کو دھوؤ اور اپنے ہاتھوں کو بھی کہنیوں سمیت اور اپنے سروں پر ہاتھ پھیرو اور (دھوؤ) اپنے پیروں کو بھی ٹخنوں سمیت[2]۔

شیعوں کا طریقہ وضو اور برادران اہلسنت کی ایک غلط فہمی:

اکثر برادران اہلسنت کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے شیعہ وضو میں پہلے پاؤں دھوتے ہیں۔ حالانکہ اصل حقیقت اس طرح نہیں بلکہ اسلام کے احکام ہر غریب، امیر اور مزدور کے لیے یکساں ہیں۔ انسانی

---

[1] ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی ص ۱۷۱ شائع کردہ شیخ برکت علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور مطبوعہ ۱۹۵۴ء

[2] ترجمہ قرآن مولانا اشرف علی تھانوی ص شائع کردہ تاج کمپنی

معاشرے میں ہر دور میں ایسے افراد موجود رہے ہیں اور آج بھی اکثریت ایسے افراد کی ہے جنہیں اپنے کام کاج کے سلسلے میں محنت مزدوری کرنی پڑتی ہے وہ ہر وقت بند جوتا پہن کر اپنے پاؤں پاک و پاکیزہ نہیں رکھ سکتے اس لیے وضو کرنے سے پہلے انہیں دھوکر پاک کرلیا جاتا ہے اور وضو کے آخر میں ان پر مسح کرلیا جاتا ہے البتہ اگر کسی شخص نے ظہر عصر کی نماز پڑھی ہے اس کے بعد جرابیں پہن کر بند جوتا پہن لیا پھر مغرب عشاء تک اس کے پاؤں پاک رہے ہوں تو ایسی صورت میں پاؤں پہلے نہیں دھوئے جاتے بلکہ ان پر صرف مسح کرلیا جاتا ہے۔

برادران اہلسنت کی جرابوں جوتوں اور موزوں پر مسح کرنے کی چند روایات پر ایک نظر:

برادران اہلسنت شیعوں پر یہ کہہ کر تنقید کرتے ہیں کہ قرآن تو وضو میں پاؤں دھونے کا حکم دیتا ہے۔

جب کہ شیعہ پاؤں پر مسح کرتے ہیں لیکن جب اہلسنت کی کتب احادیث پر نظر ڈالی جائے تو وہاں صرف پاؤں پر مسح کی روایات موجود نہیں بلکہ جرابوں، جوتوں اور موزوں پر مسح کی بہت ساری روایات موجود ہیں میں بطور مثال صرف چند روایات پیش کرتی ہوں۔

سنن ابن ماجہ کی حدیث ملاحظہ ہو:

عن المغیرہ بن شعبہ ان رسول ﷺ توضا ومسح

علی الجوربین والنعلین

حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایات ہے کہ آنحضرتؐ نے وضو کیا اور مسح کیا جرابوں اور جوتوں پر۔[1]

اس حدیث کی شرح میں مولانا وحید الزمان لکھتے ہیں:

شارع نے اپنی امت پر آسانی کے لیے پاؤں کا دھونا ایسی حالت میں جب موزہ یا جراب یا جوتا پہنا ہو معاف کردیا جیسے سر کا مسح عمامہ بندھی ہوئی حالت میں پھر اس آسانی کو قبول نہ کرنا اور اس میں عقلی گھوڑے دوڑانا کیا ضروری ہے۔[2]

سنن ابی داؤد کی ایک حدیث کی شرح میں مولانا وحید الزمان خان مرحوم لکھتے ہیں:

سورہ مائدہ میں جو آیت پاؤں دھونے کی ہے وہ خاص ہے اس صورت میں جب پاؤں میں موزے نہ ہوں اور اگر موزے ہوں تو موزوں پر مسح درست ہے۔[3]

جوتوں اور پاؤں پر مسح کرنے والی سنن ابی داؤد کی حدیث ملاحظہ فرمائیں۔ اوس ابن اوس ثقفی روایت کرتے ہیں کہ

---

۱ سنن ابی ماجہ ج۱ص۲۹۰ شائع کردہ مہتاب کمپنی اردو بازار لاہور

۲ سنن ابی ماجہ ج۱ص۲۹۰ شائع کردہ مہتاب کمپنی اردو بازار لاہور

۳ سنن ابی داؤد ج۱ص۹۷ ترجمہ مولانا وحیدلزمان

ان رسول اللہ ﷺ توضا و مسح علی نعلیہ و قدمیہ

رسول پاکؐ نے وضو کیا اور مسح کیا اپنے جوتوں پر پاؤں پر۔[1]

میں اس روایت کے بارے میں اتنا ہی عرض کروں گی کہ آنحضرتؐ نے صرف پاؤں پر ہی مسح کیا ہو گا کیونکہ یہی حکم قرآن میں ہے باقی راوی کی غلط فہمی ہوسکتی ہے کیونکہ بیک وقت جوتوں پر اور پاؤں پر مسح کرنا خلاف عقل ہے۔

سنن ابن ماجہ کی ایک واضح حدیث:

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ گزرے۔ ایک شخص وضو کر رہا تھا اور موزوں کو دھو رہا تھا (وہ سمجھا کہ پیر دھونا فرض ہے پھر جب موزہ پیر پر ہوتو وہ موزہ دھونا فرض ہے) تو آپ نے ہاتھ سے اشارہ کیا گویا اس کے خیال کو دور کیا اور فرمایا کہ

انما امرت بالمسح وقال رسول اللہ ﷺ بیدہ ھکذا من اطراف الاصابع الی اصلی الساق و خطط بالا صابع

مجھے حکم ہوا ہے مسح کا اور فرمایا آپ نے اپنے ہاتھ سے (اشارہ کیا) انگلیوں کی نوکوں سے پنڈلی کی جڑ تک اور انگلیوں سے لکیر

---

۱ سنن ابی داؤد ج۱ص۹۹ ترجمہ مولانا وحید الزمان

کھینچی۔[1]

یہ حرف بہ حرف ترجمہ مولانا وحید الزمان مرحوم کا ہے جو کچھ انہوں نے بریکٹ میں لکھا ہم نے وہ بھی لکھ دیا ہے اس حدیث کے آخری فقرے یعنی مجھے حکم ہوا ہے مسح کا پھر آنحضرتؐ اپنے ہاتھ سے پاؤں کی انگلیوں کی نوکوں سے مسح شروع کر کے پنڈلی کی جڑ تک لکیر کھینچ کر بھی بتا رہے ہیں۔ یہ حدیث ہر ذی شعور کو دعوت فکر دے رہی ہے کہ آنحضرتؐ کا سنت طریقہ وہی تھا جو آپ اپنے ایک صحابی کو بتا رہے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت:

قال تخلف النبی ﷺ عنا فی سفرۃ فادر کنا و قدار مقنا العصر فجعلنا فتوضا و نمسح علی ارجلنا فنادیٰ باعلی صوتہ للاعقاب من النار مرتین او ثلثا

حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ کسی سفر میں رسول اکرمؐ ہم سے پیچھے رہ گئے۔ پھر آپ ہم سے مل گئے۔ ہمیں نماز عصر میں دیر ہوگئی تھی۔ ہم (جلدی کے باعث) پاؤں پر مسح کر رہے تھے۔ آپ نے بلند آواز سے پکارا اور دو یا تین مرتبہ فرمایا ایڑیوں کے

1 سنن ابی ماجہ ج ا ص ۲۸۷ شائع کردہ مہتاب کمپنی اُردو بازار لاہور

لیے آگ سے تباہی ہوگی۔[1]

یہ حدیث بھی اپنے اندر غور وفکر کا بہت سارا سامان رکھتی ہے اور ہر انصاف پسند کو دعوت فکر دے رہی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو کے الفاظ پر غور فرمائیں: ''فتوضاء و نمسح علی ارجلنا'' یعنی ہم نے وضو کیا اور پاؤں پر مسح کررہے تھے۔ اب فاضل مترجم مولانا عبدالحکیم اختر شاھجہان پوری نے عجیب وغریب تاویل کرتے ہوئے بریکٹ میں جلدی کے باعث پاؤں پر مسح کرنے کا لکھا ہے۔ ہر ذی شعور فرد کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اگر وضو میں پاؤں دھونے کا حکم ہو نماز کی خواہ کتنی ہی جلدی کیوں نہ ہوتی۔ کیا ایک صحابی رسول اور پھر رسول پاکؐ کے سامنے غلط وضو کرسکتا تھا؟ حدیث کے الفاظ بتاتے ہیں کہ نماز ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ پھر نماز کی تو آخری رکعت میں بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ ہم یہ بھی فرض کر لیتے ہیں کہ

جناب عبداللہ بن عمرو نے پاؤں دھونے کی بجائے ان پر مسح کر لیا اور آنحضرتؐ سامنے دیکھ رہے ہیں۔ آپ بانی شریعت تھے۔ آپ فوراً فرماتے کہ عبداللہ تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو؟ وضو میں پاؤں دھونے کا حکم ہے اور آپ لوگ مسح کر رہے ہیں۔ حدیث

1 بخاری ج ا ص ۶۰-۱۵۹ ترجمہ فاضل شہیر مولانا عبدالحکیم اختر شاجہانپوری شائع کردہ فرید یہ بک اسٹال ۴۰ اردو بازار لاہور۔

کے الفاظ پر ذرا غور کریں تو شیعہ موقف کی تائید ہوتی ہے کیونکہ شیعہ کہتے ہیں۔ وضو میں پاؤں پر مسح کرنے کا حکم ہے اور اگر پاؤں ناپاک ہوں یا مٹی وغیرہ سے آلودہ ہوں تو وضو سے پہلے انہیں اچھی طرح دھو کر صاف کر لیں۔ اب حدیث شریف کے جو الفاظ ہیں، اس میں آنحضرتؐ نے حضرت عبداللہ بن عمرو وغیرہ کی صرف ایڑیوں کی طرف اشارہ فرمایا۔ اس کی یہی وجہ سمجھ آتی ہے کہ ان کی ایڑیاں مٹی وغیرہ سے آلودہ ہوں گی۔ حضرت عبداللہ بن عمرو اپنے طور پر اپنے پاؤں کو پاک ہی سمجھتے ہوں گے اور آنحضرتؐ نے بھی ان کی ظاہری حالت کی طرف توجہ فرمائی تو ان کی توجہ ایڑیوں کی جانب مبذول کروائی ورنہ آپ سیدھا حکم دیتے کہ پاؤں پر مسح کرنے کی بجائے انہیں دھوؤ۔ اب پاؤں کا مسح کرتے ہوئے دیکھ کر انہیں نہ ٹوکنا صاف بتا رہا ہے کہ وضو میں پاؤں کے مسح کا ہی حکم ہے۔
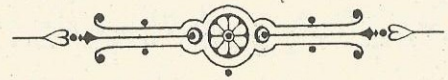
حضرت علیؑ کا طریقہ وضو

حضرت علیؑ مسجد کوفہ میں تشریف فرما ہیں۔ نماز کا وقت ہوتا ہے۔
فزال بن سیرہ حضرت علیؑ سے نقل کرتے ہیں۔

ثم اتی بماء فشرب و غسل وجهه ویدیه و ذکر رأسه و رحلیه

اس وقت ان کے (حضرت علیؑ کے) پاس پانی آیا۔ انہوں نے پیا اور ہاتھ منہ دھوئے۔ راوی نے سر اور پاؤں کا بھی ذکر کیا۔

یہ ترجمہ مولانا وحید الزمان کا ہے۔ اب حاشیے پر پاؤں کے بارے میں حضرت علیؑ کا طرز عمل لکھتے ہیں کہ

ان پر مسح کیا شاید پاؤں میں موزے ہونگے۔[1]

ہم کہتے ہیں کہ جب بخاری شریف کی روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ نے وضو میں پاؤں پر مسح کیا تو پھر وحید الزمان کا انداز ملاحظہ فرمائیں۔ پہلے تو ترجمہ کرتے وقت بات کو گول کر گئے اور حاشیے پر لکھا ہے کہ حضرت علیؑ نے پاؤں پر مسح کیا پھر اپنے دل کو تسلی دینے کے

---

1 ملاحظہ ہو تیسرا لباری شرح بخاری ج ۷، ص ۴۲۹ شائع کردہ تاج کمپنی کراچی

لیے لکھتے ہیں کہ ''شاید پاؤں میں موزے ہوں گے۔'' مولانا وحید الزمان یا دیگر علمائے اہلسنت جوان کے جی میں آئے تاویلیں کرتے رہیں۔

قرآن وسنت سے پاؤں کا مسح ہی ثابت ہوتا ہے۔

سید ابوالاعلی مودودی وضو کی آیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

ارجلکم کی دو متواتر قرأتیں منقول ہوئی ہیں۔ نافع عبداللہ بن عامر حفص کسائی اور یعقوب کی قرات اَرْجُلَکُمْ ہے۔ جس سے پاؤں دھونے کا حکم ثابت ہوتا ہے اور عبداللہ بن کثیر حمزہ بن حبیب ابوعمرو بن الاعلاء اور عاصم کی قرأت اَرْجُلِکُمْ ہے۔ جس سے مسح کرنے کا حکم نکلتا ہے۔ بظاہر ایک شخص محسوس کرے گا۔

یہ دونوں قرأتیں متضاد ہیں لیکن نبی اکرمؐ کے عمل سے معلوم ہو گیا کہ دراصل ان میں تضاد نہیں ہے بلکہ یہ دو مختلف حالتوں کے لیے الگ الگ احکام کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس آدمی کو وضو کرنا ہو تو اسے پاؤں دھونا چاہیے باوضو اگر تجدید وضو کرے تو وہ صرف مسح پر اکتفا کرسکتا ہے۔[1]

تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ یہی بات علامہ جلال الدین سیوطی نے تفسیر اتقان میں بھی لکھی ہے۔[2]

صحیح مسلم مع مختصر شرح نووی کی عبارت ملاحظہ ہو:

---

1 ملاحظہ ہو رسائل و وسائل ج ۳، ص ۱۳۲ ـ ۱۳۳

2 تفسیر اتقان ج ۲، ۷۹ ترجمہ مولانا محمد علیم انصاری شائع کردہ ادارہ اسلامیات لاہور

محمد بن جریر اور جبائی معتزلہ کے امام نے کہا ہے کہ اختیار ہے خواہ مسح کرے دونوں پاؤں پر خواہ ان کو دھوئے اور بعض نے یہ کہا کہ مسح اور دھونا دونوں واجب ہیں۔[1]

مولانا وحید الزمان کی تحقیق ملاحظہ فرمائیں:

اہلسنت کے یہ بہت بڑے سکالر لکھتے ہیں:

علامہ ابن جریر طبری اور شیخ محی الدین بن عربی نے یہ کہا ہے کہ نمازی کو اختیار ہے چاہے وضو میں پاؤں دھوئے، چاہے مسح کرے۔ عکرمہ اور چند تابعین سے بھی مسح منقول ہے۔[2]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

اکثر اہلسنت کے نزدیک پاؤں دھونا فرض ہے اور بعضوں نے کہا کہ مسح اور دھونا دونوں کافی ہیں اور نمازی کو اختیار ہے خواہ ان کو دھوئے یا ان پر مسح کرے۔[3]

میں معزز علمائے اہلسنت سے اتنی گزارش کرتی ہوں کہ جب بڑے بڑے علمائے اہلسنت نے یہ لکھا ہے کہ وضو میں پاؤں پر مسح کرنے کا نمازی کو اختیار ہے بلکہ حضرت عکرمہ اور کئی تابعین سے مسح منقول ہے

---

1 صحیح مسلم مع مختصر شرح نووی ج ۱، ص ۳۷۷ شائع کردہ نعمانی کتب خانہ

2 لغات الحدیث کتاب ''س'' ص ۷۶ شائع کردہ میر محمدی کراچی

3 لغات الحدیث کتاب ''ض'' ص ۴۷

اور تابعی اسے کہتے ہیں جس نے صحابہ کرامؓ کی زیارت کی ہو، اگر یہ بات
عوام کو بھی بتا دی جائے تو ایک طرف ان کے لیے سہولت پیدا ہو گی اور
دوسری طرف مسلمان ایک دوسرے کے قریب آسکیں گے کیونکہ شیعہ وضو
نہ صرف قرآن وسنت، بلکہ صحابہ وتابعین سے بھی ثابت ہے۔
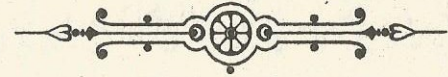
روزہ رکھنے اور کھولنے کے وقت
کے بارے میں اختلاف

روزہ افطار کرنے کا وقت قرآن وسنت کی روشنی میں:

تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک
کے روزے فرض کیے ہیں لیکن بدقسمتی سے یہاں بھی اختلاف کی ایک
صورت پیدا ہوگئی ہے۔ برادران اہلسنت جونہی سورج غروب ہوتا ہے،
روزہ افطار کر دیتے ہیں لیکن مکتب اہلبیت کے پیروکار یعنی شیعہ چند منٹ
دیر سے روزہ کھولتے ہیں۔ قرآن وحدیث میں روزہ کھولنے کا وقت اتنے
واضح اور صاف لفظوں میں بیان ہوا ہے کہ معمولی عقل وفکر رکھنے والا آدمی
بھی آسانی سے سمجھ سکتا ہے اس لیے ہم قرآن وسنت کی روشنی میں ہی اس
پر غور کرتے ہیں۔

قرآن کس وقت روزہ کھلنے کا حکم دیتا ہے؟

سورہ البقرہ میں ارشاد الٰہی ہے:

وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ
الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى

الَّیۡل(سورہ البقرہ آیت 187)
اور کھاؤ اور پیو(بھی) اس وقت تک کہ تم کو سفید خط(یعنی نور)
صبح (صادق) کا متمیز ہو جائے۔ سیاہ خط سے پھر(صبح صادق
سے) رات تک روزہ کو پورا کیا کرو۔ (ترجمہ مولانا اشرف
علی تھانوی)

شیخ الہند مولانا محمود الحسن کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

اور کھاؤ اور پیو جب تک کہ صاف نظر آئے تم کو دھاری سفید صبح
کی جدادھاری سیاہ سے پھر پورا کرو روزہ کو رات تک۔
(ترجمہ مولانا محمود الحسن دیوبندی)

اس آیت کے آخری حصہ میں روزہ کھولنے کے وقت کی
وضاحت موجود ہے کہ اتموا الصیام الی اللیل یعنی تمام کرو روزہ رات
تک چونکہ شیعہ اور اہلسنت کے درمیان اس بات پر اختلاف موجود ہے کہ
افطاری کس وقت کی جائے؟ مناسب معلوم ہوتا ہے احادیث سے رجوع
کر کے اصل صورتحال معلوم کی جائے۔

وقت افطاری احادیث کی روشنی میں:

احادیث اس سلسلے میں کیا کہتی ہیں؟ ملاحظہ فرمائیں:

آنحضرتؐ کہیں تشریف لے جارہے ہیں، صحابہ کرامؓ ساتھ ہیں،
رمضان کا مہینہ ہے، سورج غروب ہو جاتا ہے۔ حدیث کے اصل الفاظ

بخاری شریف میں اس طرح آئے ہیں:

فلما غربت الشمس قال انزل فاجدح لنا

یعنی جب سورج ڈوب گیا تو آپؐ نے (ایک شخص سے) فرمایا:
اتر ہمارے لیے ستو گھول۔ اس نے کہا کہ ابھی تو بہت وقت باقی
ہے۔ آپ نے فرمایا:

اذا رایتم اللیل اقبل من ھاھنا فقد افطر الصائم و
اشار بأصبعه قبل المشرق

جب تم دیکھو رات کی تاریکی ادھر پورب (مشرق) کی طرف سے
آن پہنچی تو روزے کے افطار کا وقت آ گیا اور آپؐ نے انگلی سے
پورب (مشرق) کی طرف اشارہ کیا۔[1]

صحیح مسلم کی حدیث میں آنحضرتؐ کے الفاظ زیادہ تفصیل سے
بیان ہوئے ہیں۔ آپؐ فرماتے ہیں:

قال بیدہ اذا غابت الشمس من ھھنا وجاء اللیل
من ھھنا فقد افطر الصائم

[1] تیسرا لباری شرح بخاری ج ۳،ص ۱۱۶ ترجمہ وحید الزمان خان شائع کردہ تاج کمپنی
کراچی+ بخاری شائع کردہ مکتبہ تعمیر انسانیت ج ا،ص ۶۹۵ مطبوعہ لاہور

آپ نے ہاتھ سے اشارہ فرمایا کہ جب سورج ڈوب جائے اس طرف کو (مغرب میں) اور آجائے رات اس طرف سے (مشرق سے) پس روزہ کھل چکا صائم کا۔[1]

امام ترمذی نے افطاری کے متعلق ایک باب باندھا ہے۔ اس کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے فرمایا:

اذا قبل اللیل وادبر النھار و غربت الشمس فقد افطرت

جب سامنے آئے سیاہی رات کی مشرق اور پیٹھ موڑے دن اور غروب ہو جائے آفتاب تو تجھ کو روزہ کھولنا چاہیے۔[2]

کتنے صاف الفاظ میں روزہ کھولنے کا مسئلہ آنحضرتؐ نے بیان فرمایا ہے۔ میں اپنے محترم قارئین سے گزارش کروں گی کہ وہ مندرجہ بالا احادیث کے الفاظ بار بار غور سے پڑھیں۔ کیا نبی اکرمؐ نے یہ فرمایا ہے کہ جونہی سورج غروب ہو جائے تو روزہ کھول دیا جائے جیسا کہ برادران اہل سنت کا معمول ہے۔ آنحضرتؐ نے دو باتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ایک تو سورج مغرب کی طرف غروب ہو جائے اور دوسرا مشرق کی

1 صحیح مسلم مع مختصر شرح نووی ج ۳، ص ۱۰۹ تا ۱۱۰ ترجمہ مولانا وحید الزمان

2 جامع ترمذی ج ۱، ص ۲۶۶ ترجمہ مولانا بدیع الزمان خان مطبوعہ لاہور

طرف سے رات کی سیاہی نمودار ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی روزہ افطار نہیں کرتے بلکہ مشرق کی طرف سے رات کے آثار نمودار ہونے تک تقریباً دس منٹ انتظار کرتے ہیں۔

یہی حکم بانی شریعت نے ہم سب مسلمانوں کو دیا ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی شخص ضد اور ہٹ دھرمی پر اتر آئے تو اس کا کوئی علاج نہیں اب ہم اس مسئلے میں تھوڑا مزید غور کرتے ہیں۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب:

اکثر علمائے اہل سنت یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ روزہ کھولنے میں جلدی کی جائے۔ جیسا کہ مولانا وحید الزمان خان نے ابن ماجہ کے ترجمہ میں آنحضرتؐ کے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ

ہمیشہ لوگ بہتری کے ساتھ رہیں گے جب تک افطار جلدی کیا کریں گے۔ اس لیے کہ یہود افطار میں دیر کرتے ہیں۔[1]

اب اس جلدی کا مطلب بھی یہی ہو سکتا ہے کہ حکم قرآن کے مطابق اور پیغمبر اکرمؐ کے فرمان کے مطابق جونہی سورج غروب ہونے کے بعد مشرق سے رات کے آثار نمودار ہوں، روزہ کھولنے میں جلدی کی جائے نہ کہ وقت آنے سے پہلے روزہ افطار کر دیا جائے۔ حاشیہ ابن ماجہ

1 ملاحظہ ہو ابن ماجہ ج ۱، ۸۴۰ شائع کردہ مہتاب کمپنی لاہور

پر مولانا وحید الزمان بھی یہی بات لکھتے ہیں کہ

وقت آنے کے بعد پھر روزہ کھولنے میں دیر نہ کریں یہ مطلب نہیں ہے کہ وقت سے پہلے کھول ڈالیں۔[1]

یہود کیسے روزہ کھولتے تھے؟

مولانا وحید الزماں خان نے پیغمبر اکرمؐ کا فرمان جو نقل کیا ہے کہ یہود افطار میں دیر کرتے ہیں۔ اس سے کیا مراد ہے؟ یہود افطار میں کتنی دیر کرتے تھے۔ مولانا وحید الزمان خان حاشیہ موطا امام مالک اور[2] شرح بخاری[3] میں لکھتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ روزہ کھولنے کے لیے تارے نکلنے کا انتظار کرتے تھے لیکن اسلام نے اس طریقہ کے برعکس دوسرا حکم دیا جو کہ اوپر قرآن و سنت کی روشنی میں بیان ہوا ہے کہ سورج ڈوبنے کے بعد مشرق سے جونہی رات کے آثار شروع ہوں، روزہ افطار کرنے کا وقت ہو جاتا ہے۔

حضرت ابو بکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کا طرزِ عمل:

مزید وضاحت کے لیے ہم حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کا طرز عمل بھی بیان کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی پروفیسر

---

1 ملاحظہ ہو ابن ماجہ ج ۱ ص ۸۳۹ شائع کردہ مہتاب کمپنی لاہور

2 موطا امام مالک ص ۲۰۸ طبع لاہور

3 تیسرالباری شرح بخاری ج ۳ ص ۱۱۷ طبع کراچی

ظہران یونیورسٹی سعودی عرب اپنی تحقیقی کتاب فقہ حضرت ابو بکرؓ میں لکھتے ہیں کہ

حضرت ابو بکرؓ مغرب کی نماز کو افطار پر مقدم کرتے تھے ان کی رائے یہ تھی کہ افطار میں تاخیر کی کافی گنجائش ہے۔[1]

موطا امام مالک میں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کا طرز عمل ملاحظہ فرمائیں۔

اصل روایت کے الفاظ اس طرح ہیں کہ

عن حمید بن عبدالرحمٰن ان عمر ابن الخطاب و عثمان بن عفان کانا یصلیان المغرب حین ینظر ان الی اللیل الاسود قبل ان یفطر ثم یفطر ان بعد الصلوٰۃ وذالک فی رمضان

حمید بن عبدالرحمن سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ بن خطاب اور حضرت عثمانؓ بن عفان نماز پڑھتے تھے۔ مغرب کی رمضان میں جب سیاہی ہوتی تھی پچھان (مغرب) کی طرف پھر بعد نماز کے روزہ کھولتے تھے۔[2]

---

1 فقہ ابو بکرؓ ج ۱ ص ۲۰۶ شائع کردہ ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور

2 موطا امام مالک ص ۳۰۸ ترجمہ مولانا وحید الزمان طبع لاہور

یہی روایت موطا امام محمدؒ میں بھی ہے۔ مَیں صرف اردو ترجمہ ہی لکھتی ہوں۔ امام محمدؒ لکھتے ہیں:

حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہما رمضان میں رات کی سیاہی نمودار ہوتے ہی روزہ افطار کرنے سے قبل نماز مغرب ادا کرتے تھے پھر نماز کے بعد روزہ افطار کرتے تھے۔[1]

یہ روایت نقل کرنے کے بعد امام محمدؒ لکھتے ہیں:

اس میں ہر طرح کی گنجائش ہے جو چاہے نماز سے پہلے افطار کرے اور جو چاہے بعد میں کرے۔ دونوں صورتوں میں کوئی حرج نہیں۔

افطاری میں بے صبری کرنے والوں کے لیے نامور اہلسنت مفسرین کا فکر انگیز پیغام:

آج کل جس طرح برادران اہل سنت کے ہاں افطار کے وقت افراتفری اور گھبراہٹ کا عالم ہوتا ہے، اسے خود بزرگ علمائے اہل سنت بھی جانتے ہیں لیکن خدا معلوم کسی مصلحت کی بناء پر خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں؟ بعض اہل سنت علماء نے اگر کچھ کہا بھی ہے تو وہ کتابوں کی زینت بنا ہوا ہے مثلاً مولانا محمد شفیع سابقہ مفتی دارالعلوم دیوبند ''روزہ کے معاملے میں احتیاط'' کے زیر عنوان اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ

---

1 موطا امام محمد ترجمہ حافظ نذر احمد ص ۱۸۳ شائع اسلام اکادمی لاہور

افطار میں دو تین منٹ تاخیر کرنا بہتر ہے[1]۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی جنہیں بات کو سمجھنے اور سمجھانے کا سلیقہ آتا ہے۔

لیکن وقت افطار کی وضاحت کرتے ہوئے اپنی تفسیر میں خود الجھ گئے ہیں، وہ بھی اتنی بات لکھنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ

آج کل لوگ سحری اور افطار دونوں کے معاملے شدت احتیاط کی بنا پر کچھ بے جا تشدد برتنے لگے ہیں مگر شریعت نے ان دونوں اوقات کی کوئی ایسی حد بندی نہیں کی ہے جس سے چند سیکنڈ یا چند منٹ ادھر ادھر ہو جانے سے آدمی کا روزہ خراب ہو جاتا ہے۔

پھر آخر میں لکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ ''جب رات کی سیاہی مشرق سے اٹھنے لگے تو روزے کا وقت ختم ہو جاتا ہے[2]۔

جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری وقت افطار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ارشاد سے وضاحت فرمادی ''اذا ادبر النّھار من ھٰھنا واقبل اللیل من ھٰھنا'' جب ادھر (مغرب) سے دن پیٹھ پھیر دے اور ادھر (مشرق) سے رات آجائے وہ وقت

معارف القرآن ج ا،ص ۴۵۶ طبع لاہور

تفہیم القرآن ج ا،ص ۱۴۶

ہے افطار کا۔ پھر لکھتے ہیں: بعض لوگ روزہ کے افطار میں اتنی جلدی کرنے لگے ہیں کہ سورج بھی صحیح طور پر غروب نہیں ہوتا کہ وہ افطار کا نارہ بجادیتے ہیں[1]۔

اھلسنت مفسر جناب جاوید احمد غامدی مدیر ماھنامہ اشراق اپنے ایک مضمون ''روزہ قرآن کی روشنی میں'' تحریر فرماتے ہیں کہ

بعض فقہا کا خیال ہے کہ غروب آفتاب کے ساتھ رات کا آغاز ہوتے ہی روزہ کھول لینا چاہیے بعض اھل علم کے نزدیک جب کچھ رات گزر جائے تو پھر روزہ افطار کرنا چاہیے اس اختلاف کے نتیجے میں عملاً دس پندرہ منٹ کا فرق پڑتا ہے۔ یہ بات کو سمجھنے کا اختلاف ہے اسے بڑا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے جس بات پر اطمینان محسوس ہو اسے اختیار کر لینا چاہیے۔[2]

میں محترم جاوید احمد غامدی صاحب کی خدمت میں عرض کرتی ہو کہ جب تک آپ جیسے علماء کا طبقہ خود پہل نہیں کرے گا اس وقت تک عوام الناس کی کیا مجال کہ دس پندرہ منٹ تو دور کی بات ہے اور وہ افطاری کا اعلان ہونے کے بعد دس پندرہ سیکنڈ کی بھی تاخیر کر سکیں اگر آپ پوری دیانتداری سے یہ سمجھتے ہیں کہ افطاری کے مسئلے پر امت سے اجتماعی غلطی

۱ تفسیر ضیاء القرآن ج،ص ۱۲۸ طبع لاہور

۲ ماھنامہ اشراق ص ۳۰ بابت دسمبر ۲۰۰۱ء لاہور

ہو رہی ہے تو پھر جرأت کا مظاہرہ کریں لیکن یہ سعادت کس خوش قسمت کے حصے میں آتی ہے اس کا اصل طریقہ یہ ہے کہ بڑی مسجد سے چھوٹی مسجد تک کا خطیب عوام الناس کو احسن انداز میں صحیح صورتحال سے آگاہ کرے کیونکہ لوگوں کے ذہن میں تو یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ روزہ کھولنے میں ذرہ برابر تاخیر ہوئی تو روزہ مکروہ ہو جاتا ہے تحریراً تو عرب و عجم کے علماء وفقہاء بیان کرتے ہی رہتے ہیں۔ مثلاً سعودی عرب کے مفتی شیخ عبداللہ بن عبدالرحمن الجبرین سے ایک سائل نے پوچھا کہ:

کیا مغرب کی اذان ہوتے ہی افطار کرنا ضروری ہے یا اس میں کچھ تاخیر کر لینا بھی جائز ہے کیونکہ میں اپنی ڈیوٹی سے نماز مغرب کی ادائیگی کے تقریباً نصف گھنٹہ بعد ہی گھر جا سکتا ہوں۔

اس کے جواب میں شیخ عبداللہ بن عبدالرحمن الجبرین نے بخاری کی وہ حدیث بھی نقل کی ہے جو سید مودودی اور جسٹس ازھری کی زبانی میں اوپر نقل کر چکی ہوں اور آخری میں لکھتے ہیں کہ

کھانے کے انتظار کا عذر ہو یا کوئی بہت ضروری کام ہو یا آدمی مسلسل چلنے کی حالت میں ہو تو افطاری میں تاخیر کرنا جائز ہے۔[1]

میری تمام انصاف پسند اہل سنت بھائیوں سے اپیل ہے کہ وہ

۱ فتاوٰی الصیام از شیخ عبداللہ بن عبدالرحمن الجبرین و محمد بن صالح العثیمین ترجمہ عبدالمالک مجاھد طبع دارالسلام لاہور

وقت افطار کے بارے میں قرآن اور پیغمبر اکرمؐ کے حکم پر غور فرمائیں۔ آنحضرتؐ نے بڑے سیدھے سادھے الفاظ میں فرمایا ہے کہ جب سورج مغرب میں ڈوب جائے اور مشرق کی طرف سے رات کی سیاہی نمودار ہو تو روزہ افطار کیا جائے۔ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ نماز مغرب پڑھ کر روزہ افطار کرتے ہیں۔ مفسرین اہل سنت نے بھی آپ کو پیغام دے دیا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اور ہمارے اہل سنت بھائیوں کو بھی قرآن و سنت کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

مسافر کے روزے کے احکام قرآن وسنت کی روشنی میں:

شیعہ حضرات ماہ رمضان میں اگر کہیں سفر پر جائیں تو روزہ قضاء کرتے ہیں بشرطیکہ سفر شرعی ہو۔ مثلاً کسی کے خلاف ناجائز عدالتی کارروائی یا جھوٹی گواہی دینے کے لیے سفر اختیار نہ کیا گیا ہو یا لہوولعب کی کسی محفل میں شرکت کے لیے بھی وہ سفر نہ ہو۔ دوسری طرف برادران اہل سنت سفر میں بھی روزہ رکھ لیتے ہیں۔ ہم اس مسئلے پر قرآن و سنت کی روشنی میں غور کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مقدس میں سورۃ البقرہ میں حکم دیا ہے کہ اے ایمان والو! تم پر بھی اسی طرح روزے فرض کیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلی امتوں پر فرض کیے گئے تھے۔ اور ساتھ مریض اور مسافر کے روزے کے بارے میں حکم دیا کہ

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ

(البقرہ: آیت 184)

جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں (روزوں کی) اتنی ہی تعداد پوری کرے۔

اہل سنت مفسر مولانا شبیر احمد عثانی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

جو ایسا بیمار ہو کہ روزہ رکھنا دشوار ہو یا مسافر ہو تو اس کا اختیار ہے کہ روزہ نہ رکھے اور جتنے روزے کھائے اتنے ہی رمضان کے سوا اور دنوں میں روزے رکھے[1]۔

یہ تو تھا حکم قرآن اب ہم احادیث کی روشنی میں مسافر کے روزہ کا حکم معلوم کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کے فرامین سے کیا بات ثابت ہوتی ہے؟

آنحضرتؐ کا سفر میں روزہ رکھنے کی ممانعت کرنا:

حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ

---

[1] ترجمہ قرآن مولانا محمود الحسن مع تفسیر مولانا شبیر احمد عثانی ص ۳۵ شائع کردہ مکتبہ مدینہ اردو بازار لاہور۔

ایک سفر میں تھے ایک جگہ لوگوں کا ہجوم دیکھا اور ایک شخص (قیس عامری) کو دیکھا کہ لوگ اس پر سایہ کیے تھے۔ آپ نے وجہ دریافت کی تو لوگوں نے کہا کہ یہ روزہ دار ہے تو آپؐ نے جو کچھ فرمایا۔ بخاری شریف میں موجود ہے۔ آنحضرتؐ نے دوٹوک الفاظ میں فرمایا ہے کہ

لیس من البر الصوم فی السفر

سفر میں روزہ رکھنا کچھ اچھا کام نہیں۔[1]

سنن ابی داؤد اور سنن ابن ماجہ کے الفاظ ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

لیس من البر الصیام فی السفر سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں۔[2]

اور صحیح مسلم میں آنحضرتؐ کے یہ الفاظ منقول ہیں کہ

لیس البر ان تصوموا فی السفر

مطلب اس کا بھی وہی بنتا ہے جو اوپر گزر چکا ہے۔[3]

سفر میں روزہ رکھنے والا ثواب سے محروم ہے۔ (حدیث نبویؐ)

سنن نسائی شریف میں فاضل مترجم نے بڑے موٹے الفاظ میں

---

1 تیسرا الباری شرح بخاری ج ۳، ص ۱۰۸

2 سنن ابی داؤد ج ۲، ص ۲۶۳ ترجمہ وحید الزمان سنن ابن ماجہ ج ۲، ص ۸۲۶ ترجمہ مولانا وحید الزمان۔

3 صحیح مسلم کتاب الصیام ج ۳، ص ۱۲۴، ترجمہ مولانا وحید الزمان

لکھا ہے کہ سفر میں روزہ رکھنا ایسا ہے جیسے بے روزہ ہونا۔

اور حاشیہ پر لکھا ہے کہ

سفر میں روزہ رکھنے کا ثواب نہیں ہے یا روزہ رکھنا گناہ ہے۔ یعنی جس سفر میں ضرر کا احتمال ہو۔

یہ ضرر کا احتمال والی بات بھی مترجم کا ذاتی خیال ہے۔ اصل حدیث میں ایسی کوئی بات نہیں۔ اسی طرح سنن ابن ماجہ میں حضرت عبدالرحمن بن عوف سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

صائم رمضان فی السفر کالمفطر فی الحضر

سفر میں روزہ رکھنے والا ایسا ہے جیسے حضر (یعنی گھر) میں افطار کرنیوالا۔[1]

اس حدیث کی شرح میں مولانا وحید الزمان لکھتے ہیں:

ثواب نہیں یہ مبالغہ کے طور پر فرمایا تاکہ لوگ سفر میں روزہ رکھنے سے باز رہیں۔[2]

میں کہتی ہوں آنحضرتؐ نے صرف یہی نہیں فرمایا کہ سفر میں روزہ رکھنے کا ثواب نہیں بلکہ ابھی اوپر نسائی شریف کے الفاظ گزر چکے ہیں کہ سفر میں روزہ رکھنا ایسا ہے جیسے بے روزہ ہونا۔ جب وہ روزہ شمار ہی نہیں ہوگا تو پھر بات ہی ختم ہے۔ یہی بات شیعہ کتب احادیث میں امام

---

1 ملاحظہ ہو سنن ابن ماجہ ج ۱، ص ۸۲۶ تا ۸۲۷ مطبوعہ لاہور

2 ملاحظہ ہو سنن ابن ماجہ ج ۱، ص ۸۲۶ تا ۸۲۷ مطبوعہ لاہور

جعفر صادقؑ سے منقول ہے۔[1]

سفر میں روزہ رکھنے والوں کے بارے میں آنحضرتؐ کا فرمانا کہ یہ نافرمان ہیں:

حضرت جابر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ جس سال مکہ فتح ہوا تو آنحضرتؐ رمضان میں مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور آپ نے روزہ رکھا ہوا تھا۔ آپ کراع غمیم نامی جگہ پر پہنچے۔ باقی لوگوں کا بھی روزہ تھا۔ پھر آنحضرتؐ نے پانی کا ایک پیالہ منگوایا اور اس کو بلند کیا تاکہ لوگ اسے دیکھیں پھر آپؐ نے اسے پی لیا اور لوگوں نے اس کے بعد آپؐ سے عرض کی کہ بعضے لوگ روزہ رکھتے ہیں۔ یہ سن کر آنحضرتؐ نے فرمایا:

اولئك العصاة اولئك العصاة

وہی نافرمان ہیں۔ وہی نافرمان ہیں۔[2]

واضح رہے کہ حدیث کے الفاظ کا یہ حرف بحرف ترجمہ اہل سنت عالم مولانا وحید الزمان کا ہے یہی بات معمولی لفظی اختلاف سے سنن نسائی[3] میں بھی موجود ہے اور شیعہ کتب احادیث میں امام جعفر صادقؑ سے یہ حدیث روایت کی گئی اس کے الفاظ یہ ہیں کہ

---

۱ ملاحظہ ہو من لایحضرہ الفقیہہ ج ۲، ص ۸۵ مطبوعہ کراچی

۲ صحیح مسلم مع مختصر شرح نووی ج ۳، ص ۱۲۴ شائع کردہ نعمانی کتب خانہ لاہور

۳ نسائی شریف ج ۲، ص ۷۰

جب آنحضرتؐ مقام کراع الغمیم (مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام) پر پہنچے تو ظہر وعصر کے درمیان ایک پیالہ پانی منگوایا اور اسے پی کر افطار کیا مگر چند لوگ اپنے روزے پر باقی رہے۔ (افطار نہیں کیا) تو آپؐ نے ان کا نام عصاۃ (نافرمان) رکھ دیا۔ اس لیے کہ عمل کی بنیاد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر ہے۔[1]

آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

سفر میں روزہ کی رخصت خدا کی طرف سے ہدیہ ہے اسے قبول کرو۔

مسلم شریف کی حدیث میں آنحضرتؐ فرماتے ہیں:

علیکم برخصة الله الذی رخص لکم

اللہ کی رخصت قبول کرو جو تمہارے لیے دی ہے۔[2]

من لا یحضرہ الفقیہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسولؐ اللہ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ میں رمضان کے اندر سفر میں روزہ رکھوں؟ فرمایا: نہیں۔ اس نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ روزہ مجھ پر آسان ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

---

۱ من لایحضرہ الفقیہہ ج ۲، ص ۸۵ مطبوعہ کراچی

۲ ملاحظہ ہو صحیح مسلم مع مختصر شرح نووی ج ۳، ص ۱۲۵ مطبوعہ لاہور

فرمایا:

اللہ نے میری امت کے مریضوں اور مسافروں کو ماہ رمضان میں افطار عطا فرمایا ہے۔ کیا تم میں سے کوئی شخص اس کو پسند کرے گا کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو کوئی شے عطا کرے اور وہ اس کے عطیہ کو واپس کردے؟![1]

آنحضرتؐ کا ایک شخص کو روزے کے احکام سمجھانا:

سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک شخص جو کہ مسافر تھا آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا تو آپ نے اسے کھانے کی دعوت دی۔ اس نے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ میں روزہ دار ہوں۔ آپ نے اس سے فرمایا:

اجلس احدثك عن الصلوٰة وعن الصّيام ان الله وضع شطر الصلوٰة اونصف الصلوٰة فالصوم عن المسافر

(نبی کریمؐ نے اس شخص سے فرمایا) بیٹھ میں تجھے بتاتا ہوں نماز اور روزے کا حال اللہ جل جلالہ نے معاف کر دی آدھی نماز اور روزہ مسافر کو۔[2]

اسی طرح سنن نسائی میں حضرت ابو قلابہ روایت کرتے ہیں کہ رسولؐ اللہ سفر میں نکلے آپؐ کے سامنے کھانا آیا اور آپؐ نے ایک شخص

1 من لایحضرہ الفقیہ ج ۲، ص ۸۵ مطبوعہ کراچی

2 ملاحظہ ہو سنن ابی داؤد ج ۲، ص ۲۶۳ ترجمہ مولانا وحید الزمان

سے فرمایا: آؤ اور کھانا کھاؤ۔ وہ بولا: میں روزے سے ہوں۔ آپؐ نے اس آدمی سے فرمایا:

ان الله وضع عن المسافر نصف الصلوٰة والصّيام فی السفر

اللہ تعالیٰ نے مسافر کو آدھی نماز اور روزہ سفر میں معاف کر دیا ہے۔

ایک حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں کہ آنحضرتؐ نے اس شخص سے فرمایا:

تو نہیں جانتا جو اللہ نے معاف کیا ہے مسافر کو۔ اس نے کہا کہ کیا معاف کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: روزہ اور آدھی نماز۔[1]

نتیجہ بحث:

مسافر کے روزہ کی اس ساری بحث سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ

1- سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ مسافر کو آدھی نماز اور روزہ قضا کرنے کا حکم ہے۔

2- پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں ہے۔

3- آنحضرتؐ نے یہ بات بھی واضح کردی کہ سفر میں روزہ رکھنا ایسا ہے جیسے بے روزہ ہونا۔

1 سنن نسائی شریف ج ۲، ص ۷۵ مطبوعہ لاہور ترجمہ مولانا وحید الزمان

-4 آنحضرتؐ نے یہ بھی فرمایا کہ سفر میں روزہ رکھنے والے نافرمان ہیں۔

-5 آنحضرتؐ نے یہ بھی فرمایا کہ سفر میں روزہ کی رخصت خدا کی طرف سے ہدیہ ہے اسے قبول کرو۔ پھر آپؐ نے ایک مسافر کو اپنے پاس بٹھا کر یہی بات سمجھا دی۔

قرآن ملت اسلامیہ کی مشترکہ میراث

شیعوں پر تحریف قرآن کا افسوسناک الزام:

ویسے تو اسلامی فرقوں میں بہت سارے فروعی اختلافات موجود ہیں اور یہ اختلافات صرف اہل سنت اور شیعوں کے درمیان ہی نہیں بلکہ حنفی، مالکی، حنبلی اور امام شافعی کی فقہ کے ماننے والوں کے درمیان بھی موجود ہیں لیکن ان تمام چھوٹے موٹے اختلافات کے باوجود تمام اہل اسلام کا ایک خدا اور ایک رسولؐ ایک قبلہ اور ایک قرآن ہے لیکن مقام افسوس ہے کہ بعض ناسمجھ اور حقائق سے بے خبر مولوی صاحبان شیعوں پر یہ جھوٹا الزام عائد کرتے چلے آرہے ہیں کہ شیعہ اس قرآن کو نہیں مانتے۔

شیعہ مساجد اور گھروں میں کس قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے؟

ہماری تمام پڑھے لکھے اور روشن فکر افراد سے گزارش ہے کہ کیا شیعہ مساجد اور شیعوں کے گھروں میں اس قرآن کی تلاوت نہیں کی جاتی جس کی برادران اہلسنت تلاوت کرتے ہیں۔ میرے خیال میں اس الزام کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی ایک دلیل کافی ہے لیکن ان مولوی صاحبان سے خدا سمجھے جو سادہ لوح عوام کو گمراہ کرتے ہیں کہ شیعوں کا اس قرآن

کے علاوہ کسی اور قرآن پر اعتقاد ہے۔

تحریف قرآن کی نفی شیعہ علماء کے کلام کی روشنی میں شیخ صدوق لکھتے ہیں:

اعتقادنا فی القرآن الذی انزله الله تعالیٰ علی نبیه محمد صلی الله علیه وآله وسلم هو ما بین الدفتین و هو فی ایدی الناس لیس باکثر من ذالك (الی عن قال) ومن تسب الینا انا نقول انه اکثر من ذالك فهو کالب

مقدار قرآن کے بارے میں ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ وہ قرآن جو خداوند عالم نے اپنے پیغمبر حضرت محمدؐ پر نازل کیا۔ وہ یہی ہے جو دو دفیتوں (دو گتوں) کے درمیان لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت موجود ہے، اس سے زیادہ نہیں ہے (پھر لکھتے ہیں) جو شخص ہماری طرف یہ بات منسوب کرے کہ ہم موجود قرآن سے زائد قرآن کے قائل ہیں، وہ جھوٹا ہے۔[1]

یہ الفاظ تو آج سے ایک ہزار سال قبل پیدا ہونے والے شیعہ عالم دین کے ہیں۔ مزید علماء کے بیانات ملاحظہ فرمائیں۔

مرحوم آیت اللہ سید ابوالقاسم خوئی لکھتے ہیں:

---

1 رسالہ اعتقادیہ ص ۹۳ مطبوعہ ایران

جو قرآن آج ہمارے ہاتھ میں ہے وہی مکمل قرآن ہے جو رسول اکرمؐ پر نازل ہوا۔ بہت سے علمائے کرام نے اس کی تصریح فرمائی ہے جیسا کہ شیخ صدوقؒ شیخ ابو جعفر طوسیؒ نے اپنی تفسیر البیان میں محسن کاشانی نے الوافی ج ۵ میں شیخ جواد بلاغی نے اپنی تفسیر آلاء الرحمن میں وغیرہ وغیرہ[1]۔

علامہ علی نقی اپنے مقدمہ تفسیر القرآن میں لکھتے ہیں:

ہم نے بارہا اعلان کیا اور پھر اعلان کرتے ہیں کہ ہم قرآن مجید اسی دو دفیتوں کے درمیان والے قرآن میں جو مسلمانوں کے ہاتھ میں موجود ہے۔ کسی قسم کا شبہ نہیں رکھتے اور ہم اس کو کلام الٰہی رسولؐ کا اعجاز، اسلام کی سچائی کا نشان اور تمام مسلمانوں کے لیے لازم العمل اور واجب الاتباع سمجھتے ہیں[2]۔

آقائے علی میلانی اپنی کتاب ''شیعہ اور تحریف قرآن'' میں رقمطراز ہیں:

شیعہ امامیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن میں قطعاً تحریف واقع نہیں ہوئی اور موجودہ قرآن بغیر کسی کمی و بیشی کے وہی ہے جو پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہوا۔

---

1 البیان فی التفسیر القرآن ص ۱۹۹ شائع کردہ جامعہ اہلبیت اسلام آباد

2 مقدمہ تفسیر القرآن ص ۱۲۳، شائع کردہ الرضا پبلیکیشنز لاہور

شیعوں کا یہ عقیدہ آج کی ایجاد نہیں بلکہ ایک ہزار سال پہلے سے لیکر آج تک شیعہ بزرگ علماء اور مشہور شیعہ مؤلفین نے اس کی وضاحت فرما دی ہے[1]۔

مشہور مفسر سید ناصر مکارم شیرازی لکھتے ہیں:

یہ آسمانی کتاب اسلام کے ابتدائی دور سے لیکر بعد تک تحریف نا پذیر مجموعہ کی صورت میں موجود رہی ہے[2]۔

ڈاکٹر محمود رامیار ''تاریخ القرآن'' میں لکھتے ہیں:

شیعہ علمائے اعلام منجملہ شیخ صدوقؒ آقائے طباطبائی اور آقائے خوئی اس کے معتقد ہیں کہ قرآن وہی ہے جو مسلمانوں کے ہاتھوں میں دو دفتیوں کے درمیان ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں[3]۔

یہ چند اقوال میں نے بطور نمونہ پیش کیے ہیں ورنہ اگر تمام شیعہ علماء کے بیانات نقل کیے جائیں تو یہ سلسلہ کئی جلدوں میں ختم نہیں ہو سکتا۔ شیعہ عالم اور مصنف مولانا طالب حسین کرپالوی نے اپنی کتاب مسئلہ تحریف قرآن میں بہت سارے شیعہ علماء کے بیانات نقل کیے ہیں۔ واضح رہے کہ مذکورہ کتاب شیعہ کے خلاف لکھی گئی تقریباً دو درجن کتب

---

۱ شیعہ اور تحریف قرآن شائع کردہ مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

۲ تفسیر نمونہ ج ۱۱، ص ۴۵ شائع کردہ مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور طبع قدیم

۳ تاریخ القرآن ص ۳۳۳، شائع کردہ مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اب میں کچھ علماء اہلسنت کے بیانات نقل کرتی ہوں جنہوں نے تسلیم کیا ہے کہ شیعہ بھی موجودہ قرآن کو اسی طرح مانتے ہیں جس طرح اہلسنت مانتے ہیں۔ کچھ علماء نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ تحریف قرآن کی روایات کتب اہلسنت میں بھی موجود ہیں۔

بعض انصاف پسند علمائے اہلسنت کا اعتراف حقیقت:

شیعوں کا ایمان بالقرآن ایسی نا قابل تردید حقیقت ہے جس کا اعتراف و اقرار بہت سارے منصف مزاج علمائے اہلسنت نے بھی کیا ہے۔ ذیل میں مختصراً ان کے بیانات نقل کیے جاتے ہیں۔

مصری محقق علامہ شیخ محمد غزالی شافعی کا بیان:

یہ مصری محقق شیعوں پر تحریف قرآن کی جھوٹی تہمت لگانے والوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

مجھے بعض لوگوں پر شدید افسوس ہوتا ہے جو بلا تحقیق بات کر جاتے ہیں اور نتائج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے تہمتیں ہانک دیتے ہیں میں نے ایک صاحب کو یہ کہتے سنا کہ شیعوں کا قرآن کوئی اور ہے اور جو ہمارے اس مشہور قرآن سے ناقص ہے حالانکہ یہاں قاہرہ میں ایک قرآن چھپتا ہے تو شیعہ اس کا احترام کرتے ہیں۔ چاہے نجف میں ہوں یا تہران میں اس کے نسخوں کو ہاتھ میں لیتے ہیں اور اپنے گھروں میں رکھتے ہیں اور کسی کے دل میں کوئی ایسا خیـ

نہیں آتا۔ سوائے کتاب اللہ کی عزت و تعظیم کے ان کا کوئی مقصد نہیں ان لوگوں پر اس قسم کی کذب بیانی اور وحی پر ایسے دروغ گوئی آخر کس لیے ہے؟ پھر آگے لکھتے ہیں جو لوگ ملت اسلامیہ میں اختلاف چاہتے ہیں جو اس تفریق کا کوئی حیلہ نہیں پاتے تو اسباب تفریق کے لیے من گھڑت باتیں گھڑ لیتے ہیں۔[1]

علامہ رحمت اللہ عثمانی ہندی لکھتے ہیں:

قرآن مجید جمہور علمائے شیعہ امامیہ اثنا عشریہ کے نزدیک تغیر اور تبدل سے محفوظ ہے جو شخص شیعوں کی طرف تحریف قرآن کی نسبت دیتا ہے۔ اس کی بات علمائے امامیہ کے نزدیک مردود اور نا قابل قبول ہے۔ اس کے بعد شیعہ کے جلیل القدر علماء کے اقوال نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

اس سے معلوم ہوا کہ وہ مسلک جو علمائے شیعہ امامیہ کے نزدیک ثابت ہے وہ یہی ہے کہ قرآن جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ پر نازل کیا تھا وہ یہی ہے جو لوگوں کے ہاتھوں میں ہے اور وہ اس زیادہ نہیں۔[2]

---

1 دفاع عن العقیدہ و الشریعہ ص ۲۶۵ تا ۲۶۶ طبع دار الکتب الحدیث مصر ۱۹۷۵ء

2 اظہار الحق ج ۲، ص ۸۹ تا ۹۰ طبع عامرہ استنبول واضح رہے کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ تین جلدوں میں وفاقی شرعی عدالت کے جسٹس محمد تقی عثمانی کے حواشی و شرح کے ساتھ "بائبل سے قرآن تک" کے نام سے مکتبہ العلوم کراچی سے شائع ہو چکا ہے اس کی تیسری جلد ص ۹ تا ۱۳ پر یہ تفصیل موجود ہے۔

محمد المدنی پرنسپل شعبہ کلیۃ الشریعہ الازہر یونیورسٹی لکھتے ہیں:

شیعہ امامیہ کے بارے میں یہ کہنا کہ معاذ اللہ شیعہ قرآن میں کمی کے قائل ہیں تو ان روایتوں کی بنا پر ہے جو شیعوں کی کتابوں میں موجود ہیں جیسا کہ ہماری کتابوں میں بھی موجود ہیں لیکن شیعہ سنی دونوں محققین نے ان روایتوں کو رد اور ان کے بطلان کو واضح کیا ہے شیعہ پر تحریف کی تہمت لگانے والوں کو علامہ سیوطی کی اتقان جیسی کتاب کو پڑھنا چاہیے کہ اس میں تحریف پر دلالت کرنے والی روایت کو دیکھیں۔ اگر چہ ہم اس قسم کی روایت کو تسلیم نہیں کرتے۔

ایک مصری عالم نے ۱۹۴۸ء میں الفرقان نام کی کتاب لکھی ہے جس میں اس قسم کی بہت سی روایات کو اہلسنت کی کتابوں سے نقل کیا ہے تو کیا اس بنا پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اہل سنت قرآن کے تقدس کے منکر ہیں؟ یا ان روایات کی بناء پر جسے فلاں نے نقل کیا ہے یا فلاں کتب جسے فلاں نے لکھا ہے؟ اہلسنت نقص قرآن کے قائل ہو گئے؟ یہی بات شیعوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے اس لیے جیسے ہماری کتابوں میں ایسی روایات موجود اسی طرح شیعوں کی کتب میں بھی ایسی روایت موجود ہیں۔[1]

---

1 رسالۃ الاسلام ج ۱۱، ص ۳۸۲ تا ۳۸۳ شمارہ ۴

شیخ التفسیر علامہ شمس الحق افغانی کا موقف:

شیخ التفسیر جامع اسلامیہ بہاولپور جنہوں نے اپنی زندگی کے چالیس برس قرآنی علوم و معارف کے پڑھنے اور پڑھانے پر صرف کیے اور اتنے عرصہ کے بعد ''علوم القرآن'' نامی کتاب لکھی۔ اس میں شیعہ اور تحریف قرآن کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

''شیعوں کا مذہب وہی ہے جو سنیوں کا ہے۔ قرآن مکمل طور پر محفوظ ہے اور اس میں ایک لفظ کی کمی بیشی نہیں ہوئی جس کے لیے شیعوں کی متعدد کتابوں کے حوالے پیش کرتا ہوں۔''[1]

اس کے بعد اس اہلسنت محقق نے شیخ صدوق، تفسیر مجمع البیان، سید مرتضیٰ، قاضی نور اللہ شوستری، شیخ حر آملی اور فروع کافی وغیرہ کتب سے مذکورہ علماء کی تحریریں نقل کی ہیں اور تسلیم کیا ہے کہ شیعہ کا اس قرآن پر اسی طرح اعتقاد ہے جس طرح اہلسنت کا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی پاکستان کا موقف ملاحظہ ہو:

امیر تنظیم اسلامی نے ''شیعہ سنی مفاہمت کی ضرورت و اہمیت'' نامی کتاب لکھی ہے اس میں شیعہ کے عقیدہ قرآن کے بارے میں لکھتے ہیں:

---

1 علوم القرآن ص ۱۳۴ تا ۱۳۶ شائع کردہ مکتبہ اشرفیہ شارع جلال الدین رومی (فیروز پور روڈ) جامع اشرفیہ لاہور

اہل تشیع کا عمومی موقف یہ ہے کہ ہم اسی کتاب کو برحق مانتے ہیں اور ہمیں ظاہر بات ہے کہ اس کا وہی موقف درست تسلیم کرنا چاہیے جو ان کی زبان سے ادا ہو رہا ہے چنانچہ ''کتاب'' ہمارے اور ان کے مابین مشترک ہے[1]۔

علامہ نجم الغنی رامپوری لکھتے ہیں:

اثنا عشریہ کمی بیشی کے قائل نہیں ہیں اور یہ جو مشہور ہے کہ شیعہ اثنا عشریہ کہتے ہیں کہ صحابہ نے دس پارے قرآن کے کم کر دیے اور بعض شیعہ سورہ حسنین اور سورہ فاطمہ اور سورہ علی پڑھتے ہیں۔ یہ جہلا کی گپ ہے آج تک سلف خلف تک کوئی محقق اثناء عشری یہ عقیدہ نہیں رکھتا۔ چنانچہ علمائے اثناء عشری اس خیال کی برأت اپنی کتابوں میں بڑی شدومد سے کرتے ہیں۔ شیخ صدوق ابوجعفر محمد بن علی بابویہ اپنے رسالہ عقائد میں کہتے ہیں کہ جو قرآن اللہ نے حضرت محمد ﷺ کو دیا تھا، وہی ہے کہ اب لوگوں کے پاس موجود ہے نہ اس میں کچھ کم ہوا ہے نہ زیادہ۔ تفسیر مجمع البیان میں کہ جو اثناء عشریوں کے نزدیک معتبر تفسیر ہے۔ سید مرتضیٰ کہتے ہیں کہ جو قرآن عہد پیغمبر کے دور میں تھا، وہی اب بھی ہے۔ بلا تفاوت

---

1 شیعہ سنی مفاہمت کی ضرورت و اہمیت ص ۲۲ شائع کردہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

قاضی نور اللہ شوستری اپنی کتاب مصائب النواصب میں کہتے ہیں کہ یہ بات جو شیعہ کی طرف منسوب کی جاتی ہے کہ وہ قرآن میں تغیر وتبدل کے قائل ہیں، سو یہ غلطی ہے۔ محققین شیعہ میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔ محمد بن حسن عاملی کہتے ہیں'' جو روایات پر ذرا بھی نظر کرے گا یقینی طور پر جان جائے گا قرآن میں بچند وجوہات کمی زیادتی ناممکن ہے۔''[1]

علامہ حافظ اسلم جیراجپوری کا بیان:

علامہ اسلم جیراجپوری نے اپنی کتاب تاریخ القرآن کے صفحہ ۶۲ تا صفحہ ۶۷ پر بزرگ شیعہ علماء مثلاً شیخ صدوق شریف مرتضی علم الہدی علامہ حرعاملی ملا محسن صاحب تفسیر صافی سید العلماء سید حسین ملا صادق قاضی نور اللہ شوستری سید دلدار علی مجتہد جیسے مستند علماء کے بیان نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> یہ ان علماء امامیہ کے اقوال میں جو اہل تشیع میں مقبول اور مستند ہیں اور ان اقوام میں کسی تاویل کی گنجائش ہے نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں نے تقیہ سے کہا ہے کیونکہ ان میں سے بعض ایسے ہیں جنہوں نے علماء اہلسنت کی تردید میں رسائل لکھے ہیں۔ ان کی

[1] مذاہب اسلام ص ۴۴۸ مطبع نولکشور لکھنو نیز منزیل الغواشی شرح اصول شاشی ص ۹ طبع کراچی

نسبت تقیہ کا گمان نہیں کیا جا سکتا اور ابو جعفر قمی کتاب الاعتقاد اور ملا محسن کی تفسیر صافی یہ دونوں کتابیں شیعہ کے نصاب درس میں داخل ہیں۔ اس لیے یہ خیال نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے عقیدہ کے خلاف اپنے فرقہ کو تعلیم دینگے۔[1]

کیا کتب اہل سنت میں تحریف کی روایت موجود نہیں ہیں؟

تصویر کا دوسرا رخ:

میں ایک مرتبہ پھر یہی گزارش کرتی ہوں کہ شیعہ بھی اسی قرآن کو مانتے ہیں اور برادران اہلسنت بھی اسی قرآن کے ماننے والے ہیں لیکن مذکورہ بالا تمام حقائق کے باوجود اگر کوئی جاہل متعصب اور حقائق سے بے خبر شخص یا گروہ یہ کہے کہ شیعہ کتب میں تحریف پر مبنی روایات موجود ہیں، ایسے افراد سے ہم اتنا عرض کریں گے کہ کیا کتب اہلسنت میں ایسی بے شمار روایات موجود نہیں ہیں جن میں موجود قرآن سے اختلاف کا بیان موجود ہے؟ اور اگر ان تمام رویات کو اکٹھا کیا جائے تو بہت بڑا دفتر تیار ہو سکتا ہے۔

چند علمائے اہلسنت کی تحریروں پر ایک نظر:

میرا مقصد چونکہ اس افسوسناک فتنہ کو ہوا دینا نہیں اور نہ ہی میں

[1] تاریخ القرآن از علامہ سلم جیراجپوری ص ۶۲ تا ۶۷ مطبوعہ لاہور

یہ چاہتی کہ تحریف قرآن کی جو روایات کتب اہلسنت میں موجود ہیں انہیں اکٹھا کر کے اہلسنت پر یہ الزام عائد کر دوں کہ وہ موجودہ قرآن کو نہیں مانتے البتہ خود ایک سنی عالم مولانا تمنا عمادی نے اپنی کتاب ''جمع القرآن'' میں تحریف پر مبنی بہت ساری روایات کو اپنی ہی کتابوں سے اکٹھا کر کے لکھ دیا ہے اور ایک دوسرے اہلسنت عالم مولانا عمر احمد عثمانی نے آیات کی جو تفصیل لکھی ہے وہ تو سینکڑوں تک جا پہنچی ہے۔ ان ہر دو علماء کا موقف ہے کہ اگر محض روایات کو دیکھ کر فیصلہ کرنا ہے تو پھر اہلسنت کی اپنی روایات کے مطابق موجودہ قرآن کی صحت سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ اب میں بطور نمونہ صرف چند روایات نقل کرتی ہوں اہلحدیث عالم مولانا وحید الزمان خان تیسرا الباری شرح بخاری کتاب التفسیر میں غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کی تفسیر کرتے ہوئے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

حضرت عمرؓ کی قرأت یوں تھی:

غیر المغضوب علیهم و غیر الضالین۔[1]

یہ تو تھی قرآن کی سب سے پہلی سورہ اب ذرا آخری دو سورتوں کے بارے میں بھی سن لیں کہ بہت ساری کتب اہلسنت میں ان کے بارے میں کیا لکھا ہوا ہے۔

---

۱ تیسرا لباری شرح بخاری ج ۶ ص ۳ کتاب التفسیر شائع کردہ تاج کمپنی (واضح رہے کہ یہ شرح بخاری نو جلدوں میں ہے)

حتی کہ پیر محمد کرم شاہ جو کہ بریلوی مکتبہ فکر کے نزدیک انتہائی قابل ہی نہیں قابل احترام بھی ہیں۔

انہیں اپنی تفسیر میں کافی وضاحت سے تردید کرنا پڑی وہ قرآن کی آخری دو سورتوں پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بعض ایسی روایات موجود ہیں جن میں یہ مذکور ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ انہیں قرآن کی سورتیں شمار نہیں کیا کرتے تھے اور جو مصحف انہوں نے مرتب کیا تھا اس میں یہ سورتیں موجود نہیں تھیں۔

پھر آگے لکھتے ہیں کہ علامہ سیوطی نے صراحتاً لکھا ہے کہ

امام احمد بزار، طبرانی ابن مردویہ نے صحیح طریقوں سے حضرت ابن مسعود سے نقل کیا ہے کہ وہ معوذتین (سورہ فلق اور سورہ الناس) کو مصحف سے محو کر دیا کرتے تھے اور کہا کرتے قرآن کے ساتھ ایسی چیزیں خلط ملط نہ کرو جو اس میں سے نہیں ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو ان دو سورتوں کے ساتھ فقط پناہ مانگنے کا حکم دیا تھا کہ حضرت ابن مسعودؓ ان سورتوں کی تلاوت نماز میں نہ کیا کرتے۔ (الدر المنثور[1])

---

۱ تفسیر ضیاء القرآن ج ۵ ص ۷۲۰ مطبوعہ لاہور

اب ایک مستند اہلسنت عالم دین جناب سید سلیمان ندوی مرحوم کا ایک بیان بھی پڑھ لیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ

ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اپنے غلام ابو یونس سے قرآن لکھوایا اور قرآن کی آیت ''حافظوا علی الصلوٰت والصلوٰۃ الوسطیٰ'' کے ساتھ وصلوٰۃ العصر کا لفظ بھی لکھوایا اور کہا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اسی طرح سنا ہے۔ اصل قرآن میں وصلوٰۃ العصر نہیں ہے۔ واضح رہے کہ مولانا ندوی نے اس روایت کے لیے جامع ترمذی کتاب التفسیر کا حوالہ دیا ہے۔[1]

علامہ جلال الدین سیوطی کی تفسیر اتقان اور روایات تحریف:

جو لوگ خواہ مخواہ شیعوں کے ذمے لگانا چاہتے ہیں کہ وہ موجودہ قرآن میں تحریف کے قائل ہیں وہ اہلسنت کے مستند اور مشہور عالم مفسر علامہ جلال الدین سیوطی کی تفسیر اتقان کا مطالعہ کریں اور اس میں کسی عام شخصیت سے نہیں بلکہ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں سورۃ الاحزاب دو سو آیتوں کی پڑھی جاتی تھی پھر جس وقت حضرت عثمانؓ نے مصاحف لکھے اس وقت ہم نے اس سورت سے بجز موجودہ مقدار کے کچھ نہیں پایا۔[2]

---

۱ سیرت عائشہ ص ۱۸۴ شائع کردہ مکتبہ مدینہ اردو بازار لاہور

۲ تفسیر اتقان ج ۲ ص ۵۴ ترجمہ مولانا محمد حلیم انصاری شائع کردہ ادارہ اسلامیات انارکلی لاہور۔

اور اس سے بڑھ کر حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا وہ بیان ملاحظہ فرمائیں جسے علامہ جلال الدین سیوطی نے نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں:

تم میں سے جو شخص یہ بات کہے گا کہ میں نے تمام قرآن اخذ کر لیا ہے در حالیکہ اسے یہ بات معلوم نہیں کہ تمام قرآن کتنا تھا کیونکہ قرآن میں سے بہت سا حصہ جاتا رہا ہے لیکن اس شخص کو یہ کہنا چاہیے کہ تحقیق میں نے قرآن میں سے اتنا حصہ اخذ کیا ہے جو کہ ظاہر ہوا ہے۔[1]

ڈاکٹر غلام جیلانی برق کا اعتراف حقیقت

ڈاکٹر غلام جیلانی برق۔ ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی معروف سنی دانشور ہیں۔ انہوں نے شیعہ سنی اتحاد کے جذبے کے تحت ''بھائی بھائی'' نامی کتاب لکھی وہ لکھتے ہیں کہ روایات تحریف اگر شیعہ کتب میں ہیں تو اہلسنت کتب بھی ان روایات سے خالی نہیں۔ اہلسنت کتب میں روایات تحریف کی موجودگی کے بارے میں لکھتے ہیں:

اس قسم کی قریباً چالیس روایات میری نظر سے گزری ہیں جن سے

---

۱ تفسیر اتقان ج ۲ ص ۶۴ ترجمہ مولانا محمد حلیم انصاری مطبوعہ لاہور

عیسائی مشنریوں اور آریہ سماجیوں اور یہودیوں نے جی کھول کر فائدہ اُٹھایا اور ہم سے یہ سوال کیا کہ جب یہ قرآن احادیث کی رو سے محرف ہے توتم اسے ساری کائنات کے سامنے کس منہ سے پیش کرتے ہو اور یہ وہ سوال ہے جس کا کوئی جواب کسی سنی عالم سے آج تک نہ بن پڑا۔[1]

علامہ تمنا عمادی کی ’’جمع القرآن‘‘ اور روایات تحریف:

برادران اہلسنت کی مستند کتب احادیث میں تحریف قرآن کی کس قدر روایات موجود ہیں جو لوگ ان پر ایک نظر ڈالنا چاہیں، وہ علامہ تمنا عمادی کی کتاب ’’جمع القرآن‘‘ کا مطالعہ کریں۔ مصنف مذکورہ نے اس کتاب میں ان بہت ساری روایات کو اکٹھا کر دیا۔

گو وہ تمام روایات تو اکٹھی نہیں کر سکے جس کا اظہار مصنف نے خود ان الفاظ میں کیا ہے۔

اگر زیر زبر اور نقطوں کے فرق بعض الفاظ یا حروف کی تبدیلی اور معنوی تحریفوں کی فہرست پیش کروں تو اس کے لیے ایک مستقل دفتر کی ضرورت ہے[2]۔

---

1 ملاحظہ ہو ’’بھائی بھائی‘‘ ص ۴۰ شائع کردہ غلام علی اینڈ سنز لاہور

2 ملاحظہ ہو ’’جمع القرآن‘ ص ۹۵ مطبوعہ کراچی

مولانا عمر احمد عثمانی اور روایات تحریف:

علامہ تمنا عمادی کی مذکورہ کتاب ’’جمع القرآن‘‘ میں مولانا عمر احمد عثمانی کا کافی طویل مضمون بعنوان ’’قرآن کریم روایات کے آئینہ میں‘‘ چھپا ہے جسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شیعوں کو تو یہ طعنہ دیا جاتا ہے کہ ان کے ہاں کوئی ’’مصحف فاطمہ‘‘ نامی قرآن ہے لیکن مولانا عمر احمد عثمانی کے مذکورہ مضمون میں ایک طرف مصحف حضرت عثمانؓ یعنی حضرت عثمانؓ کا جمع کردہ قرآن ہے تو دوسری طرف مصحف اہل مدینہ، مصحف حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ، مصحف علیؓ ابن ابی طالب، مصحف عبداللہ ابن عباسؓ، مصحف حضرت عائشہؓ اور دیگر کئی مصاحف کا ذکر ہے اور اس مضمون میں سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ ان تمام مصاحف کا موجودہ قران سے جن جن آیات کا اختلاف ہے وہ فہرستوں کی صورت میں مضمون نگار نے ترتیب دیا ہے اور صرف حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے پاس موجودہ قرآن کی موجودہ قرآن سے اختلاف کی ایک سو اڑتیس آیات کی فہرست پیش کی ہے۔ اسی طرح دیگر مصاحف کی فہرستیں بھی لکھی گئی ہیں۔

مولانا عمر احمد عثمانی کے مضمون کا مآخذ کون سا ہے؟

مولانا عمر احمد عثمانیؒ نے حضرت ابن مسعودؓ ابن عباسؓ ابن زبیرؓ وغیرہ صحابہ جن کے نام اوپر لکھے گئے ہیں کے پاس قرآن کے جو نسخے موجود تھے ان کے موجودہ قرآن سے اختلاف کی جو فہرستیں پیش کی ہیں

ان سب کا ماخذ حافظ ابو بکر عبداللہ ابن ابی داوٗد کی کتاب ''کتاب المصاحف'' ہے جس کے بارے میں مولانا عثمانی لکھتے ہیں:

یہ کتاب ابو بکر عبداللہ بن ابی داوٗد کی تصنیف ہے جن کا سن پیدائش ۲۳۰ھ اور سن وفات ۳۱۶ھ ہے آپ حدیث کے مشہور امام ابوداوٗد سلیمان بن اشعث سجستانی (جن کی کتاب سنن ابی داوٗد صحاح ستہ میں شمار کی جاتی ہے) کے صاحبزادے ہیں آپ کی ''کتاب المصاحف'' علمائے حدیث کے ہاں بہت مستند شمار کی جاتی ہے چنانچہ اکثر متقدمین کی کتاب کے حوالے ملتے ہیں۔ امام ابون الجوزیؒ نے ان کو ''ثقہ'' کبیر مامون'' کے نام سے یاد کیا ہے۔

تھوڑا اوپر اسی کتاب کے بارے میں لکھا ہے اس میں قرآن کریم سے متعلق ان تمام روایات کو یکجا کر دیا گیا ہے یہ روایتیں اکثر صحاح ستہ اور دوسری مستند کتب روایات میں منتشر طور پر ہیں[1]۔

مولانا عمر احمد عثمانی کا افسوسناک انکشاف:

مولانا عثمانی یہ تمام روایات درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

آپ کو معلوم ہے یہی ''کتاب المصاحف'' جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، شائع کس طرح ہوئی؟ ایک فاضل مستشرق ہے (Arther

---

1 جمع القرآن ص ۳۳۷ شائع کردہ الرحمن پبلشنگ ٹرسٹ مکان نمبر 7-3اے بلاک نمبر1 ناظم آباد کراچی

Jeffery) اس نے کیا یہ ہے کہ قرآن کے متعلق جس قدر اختلاف ہماری کتب روایات میں پائے جاتے ہیں، ان سب کو ایک جگہ جمع کر کے شائع کر دیا ہے۔ کتاب کا نام ہے:

Materials for the History of the text of the Quran.

اس کے ساتھ ہی اس نے اس خیال سے کہ مبادا یہ نہ کہہ دیا جائے کہ ایک غیر مسلم (عیسائی) نے معاندانہ طور پر غیر مستند چیزوں کو جمع کر دیا ہے۔ امام عبداللہ ابن ابی داوٗد کی کتاب المصاحف کو من وعن شائع کر دیا ہے جس میں وہ تمام احادیث موجود ہیں جو ان اختلافات کی سند ہے اور اس طرح ساری دنیا پر ظاہر کر دیا کہ یہ ہے اس کتاب کی حقیقت جس کے متعلق مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ نے لے رکھی ہے[1]۔ حاشیہ پر مولانا عمر احمد عثمانی لکھتے ہیں یہ کتاب (E.J.Brill) پبلشرز لیڈن سے مل سکتی ہے۔

ایک شیعہ عالم دین کی دردمندانہ اپیل:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی اس بحث کا اختتام شیعہ مفسر قرآن علامہ سید علی نقی مجتہد کے ان الفاظ پر کریں جو آج بھی مسلمانوں کو

---

1 جمع القرآن ص ۳۷۴ تا ۳۷۵ شائع کردہ الرحمن پبلشنگ ٹرسٹ مکان نمبر 7-3 اے بلاک نمبر ناظم آباد کراچی

دعوت فکر دے رہے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

موجودہ زمانے میں اسلام پر مخالفین کے حملے ہو رہے ہیں اور وہ چاروں طرف سے دشمنوں سے گھرا ہوا ہے۔ موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ضرورت اس امر کی تھی کہ تمام مسلمان ہم آہنگ ہو کر مخالفین کے مقابلے کے لیے ایک متحدہ محاذ جنگ پیش کرتے۔

بعض افراد جو خود مسلمانوں کے اندر افتراق و اختلاف کی خلیج کو وسیع کرنا اپنے لیے بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں ہر روز ایسے ایسے مسائل معرض بحث میں لانا ضروری سمجھتے ہیں جن سے خواہ مخواہ اسلامی شیرازہ منتشر اور اتحاد اسلامی کی دیوار میں رخنہ پیدا ہو۔ اگر اسلام سے سچی محبت ہو تو لازم یہ ہے کہ اس قسم کے سوالات اٹھا کر افتراق کا مظاہرہ نہ ہونے دو بلکہ تمام فرقہ اسلامیہ کے اس متفقہ عقیدہ کو کہ ''قرآن مجید وحی سماوی اور کتاب زمانی منزل من اللہ رسولؐ کا اعجاز ہے اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور نہ اس میں ذرہ برابر باطل کا شائبہ ہے اور اس پر ایمان و اعتقاد و کامل تمام مسلمانوں کے اسلام کا جزو اعظم ہے اسے متفقہ صورت پر باقی رہنے دو۔[1]

---

[1] ملخص از تحریف قرآن کی حقیقت ص ۷، ۸ شائع کردہ مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور۔

شیعہ سنی اختلافات کے نتیجے میں ہونے والی دہشت گردی

پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا۔ پاکستان کی بنیاد اس نظریہ پہ تھی کہ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں اُن کو یکجا کر کے ایک الگ وطن کا درجہ دے دیا جائے اُس وقت ہندو اور باقی قوموں کے ساتھ ایک ہندوستان میں نہ رہنے کا بہت مضبوط نظریہ یہ تھا کہ ہندو جو کہ ہندوستان میں اکثریت میں ہیں اُن کے ساتھ رہتے ہوئے مسلمان اقلیت بن جائیں گے اُن کی مذہبی آزادی پر پابندی آئے گی اور وہ زندگی کو اسلام کے اصولوں کے مطابق آزادانہ نہیں گزار سکیں گے اکثریتی علاقوں کو ملا کر پاکستان بنا دیا گیا پھر کیا ہوا کیا سب لوگوں کو اپنے طریقہ سے اپنے عقائد پر قائم رہتے ہوئے آزادانہ زندگی گزارنے کی آزادی ہے پاکستان میں؟

درحقیقت مسلمان قوم ہندوؤں کے تسلط سے تو آزاد ہو گئی اقلیت بننے سے بچ گئے لیکن کیا مسلم اکثریت والے اس پاکستان میں جس کے بارے میں کہا جاتا تھا پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ آج مسلمانوں کو تحفظ دینے میں کامیاب ہے؟

انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آج اس پاکستان میں کوئی مسلمان نہیں بلکہ کوئی شیعہ ہے کوئی سنی اور کوئی اہلحدیث اور زیادہ تر لوگ اس قدر فرقہ واریت کا شکار ہیں کہ اگر سوال پوچھا جائے کہ آپ کا مذہب کیا ہے تو جواب مسلمان نہیں ملتا بلکہ جواب ملتا ہے میں سنی ہوں، میں شیعہ ہوں اور میں اہلحدیث ہوں یہ فرقہ واریت جہاں حد سے بڑھ گئی وہاں دہشت گردی نے جنم لیا اور اس وقت پاکستان خانہ جنگی اور دہشت گردی کا شکار ہے۔ یہ دہشت گردی کوئی باہر سے آ کر نہیں کر رہا ہمارے اپنے ہی لوگ ہیں۔ جھگڑے اور دُشمنی ان کے ذاتی بھی نہیں چند انتہا پسند فرقہ ورانہ طاقتوں نے لوگوں کے برین واش کر کے اُنہیں دہشت گرد بنا دیا ہے اور یہ سلسلہ بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

پوری دُنیا کے اندر پاکستان ایک دہشت گرد ریاست بنتا جا رہا ہے ہمارا میڈیا بھی ان تمام دہشت گردی کے واقعات کو خوب ہوا دیتا ہے اور پوری دُنیا کو بتا دیا ہے کہ پاکستان کے حالات کیا ہیں اور یہاں کیا کیا ہو رہا ہے۔

پوری دُنیا میں مسلمان کا ذکر آتے ہی لوگوں کے ذہن میں دہشت گردی کا خیال آتا ہے گویا کہ ایک سازش کی جا رہی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں پر دہشت گردی کا ٹھپہ لگا دیا جائے۔ یہ سازش کرنے والی بیرونی دُشمن طاقتیں بھی ہو سکتی ہیں مگر اس میں ہمارے اپنے علما کرام اور

فرقوں میں بڑے انتہا پسند لوگوں کا کردار بہت اہم ہے۔

اور ان علما اور انتہا پسند لوگوں کو چند سیاسی گروہوں کی حمایت حاصل ہے۔ وہ (devied and role) تقسیم کرو اور حکومت کرو کے کلیے پر عمل پیرا ہیں۔ وہ اس فرقہ واریت کو ہوا دے کر اپنے سیاسی مقاصد نکالتے ہیں۔ جیسا کہ حریف سیاسی جماعتوں کے جلسے جلوسوں میں بم بلاسٹ کرانا۔ ملک میں خودکش حملے کرانا تاکہ عوام ملکی سالمیت کے بارے فکر مند رہیں اور وہ اپنے حقوق کے مطالبات بھول جائیں۔ چند سیاسی طاقتوں نے پاکستان میں فرقہ واریت کو ہوا دے کر شیعہ اور سنی اور اہل حدیث کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسہ کر دیا پھر جب دل چاہے دہشت گردی کا واقعہ کرا کر اُسی کا الزام کسی فرقہ پر ڈال دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا گو ہوں کہ وہ ہمارے ملک پاکستان اور تمام مسلمانوں کو دہشت گردی، منافرت اور فرقہ واریت پھیلانے والوں کے شر سے اپنی حفاظت میں رکھے۔ آمین۔

اہل تشیع کی نسل کشی

عرصہ دراز سے پوری دُنیا اور خاص طور پر پاکستان میں شیعہ کی نسل کشی کا سلسلہ بہت ہی ظالمانہ اور انتہائی افسوس ناک ہے جس پر نہ کبھی پاکستان گورنمنٹ نے ایکشن لیا اور نہ ہی عالمی حقوق کی تنظیموں کی کبھی نظر گئی۔ پاکستان میں شیعہ اقلیت بن کر رہ گئے ہیں اور باقی اقلیتوں کی نسبت ان کے ساتھ انتہائی جارہانہ رویہ روا رکھا گیا ہے۔ شیعہ کے جلسوں اور جلوسوں میں بم رکھ دیئے جاتے ہیں اور خاندانوں کے خاندان شہید کر دیئے گئے۔ دیکھتے ہیں کوئی اچھا عالم ہے اُس کو شہید کر دیا جاتا ہے۔ شیعہ کافر کا نعرہ لگا کر بے شمار شیعوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔

یہ کیسی آزاد ریاست ہے جہاں مسلمان اپنی مذہبی سرگرمیاں آزادانہ ادا نہیں کر سکتے۔ مساجد میں، جلسوں میں لوگ خوف ذدہ رہتے ہیں کہ جانے کب بم پھٹنے کی آواز آئے اور سب کچھ ختم ہو جائے حتیٰ کہ اہل تشیع تو اپنے گھروں میں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ یہ سلسلہ کم یا ختم ہونے کے بجائے روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ کس طرح کے مسلمان ہیں جو

مسلمانوں کو شہید کرتے ہیں جبکہ اسلام تو غیر مسلم کو بھی بلاوجہ مارنے کی اجازت نہیں دیتا۔ نبیؐ پاک نے فرمایا

ترجمہ: ''جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے لوگ محفوظ نہیں وہ مسلمان نہیں''

آپؐ جب بھی کسی لشکر کو جنگ کے لیے بھیجتے تو اُن کو حکم دیتے کہ بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور درختوں کو نقصان نہ پہنچانا۔

یعنی کہ ہمارا دین تو وہ دین ہے کہ جنگ کی حالت میں بھی جبکہ وہ غیر مسلم کے خلاف ہو، بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور درختوں کو نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں دیتا تو یہ کس دین کے پیروکار ہیں جو بم بلاسٹ کرتے ہیں کسی مجمع میں خاص طور پر دینی مجالس میں اور مساجد میں اور بازاروں میں جہاں بچے بھی ہیں عورتیں بھی ہیں اور بوڑھے لوگ بھی ہیں ہزاروں کی تعداد میں نہتے بے قصور لوگوں کو شہید کر دیا جاتا ہے۔ اور مجرم کا پتہ بھی نہیں چلتا اکثر سننے میں آتا ہے طالبان نے ذمہ داری قبول کر لی۔ کون ہیں یہ طالبان کیا کوئی مسلمان بھائی کو بلاوجہ قتل کر سکتا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس نے ایک انسان کو قتل کیا اس نے پوری

انسانیت کا قتل کیا۔

پھر فرمایا:

ترجمہ: جس نے ایک مومن کو جان بوجھ کر قتل کیا اُس کی سزا جہنم ہے''۔

اس طرح سے چند اختلافات کی وجہ سے جو لوگ شیعہ کو کافر کہہ کر قتل کر دیتے ہیں یاد رکھیں کہ اُن کے لیے تو سزا جہنم کا اعلان ہو چکا ہے۔ تو پھر بہتر یہی ہے کہ معاملات کو حقیقت پسندانہ انداز میں دیکھا جائے۔ اختلافات کو ہوا دے کر جارحیت بربریت اور ظلم کا سلسلہ بند کیا جائے تاکہ تمام لوگ اپنے اپنے عقائد پر رہتے ہوئے پُرامن اور محفوظ زندگی گزار سکیں اگر کسی شخص یا فرقے کا عقیدہ مختلف ہے تو کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ اُسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرے جیسا کہ عرصہ دراز سے ہو رہا ہے۔